پروفیسر یاسین مظہر صدیقی

ادارہ تحقیق و تصنیفِ اسلامی ۔ علی گڑھ

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

سلسلۂ منشورات ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۱۹)

کتاب ——— عہد نبوی کا نظام حکومت
مصنف ——— پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی
ناشر ——— ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
خوش نویس ——— احراز الحسن
طابع ———
صفحات ——— ۱۳۶
تعداد ——— ۱۱۰۰
ایڈیشن ——— بار اوّل ۱۹۹۴ء
قیمت ——— ۳۰ روپئے

فہرستِ موضوعات

۵۔ مذہبی نظام ۹۱

مقدمہ

(مولانا سید جلال الدین عمری)

اسلامی تاریخ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ ہمارے فاضل دوست پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا خاص موضوع ہے۔ اس کا انھوں نے بہت وسیع مطالعہ کیا ہے اور اپنے حاصلِ مطالعہ اور فکری کاوشوں سے وہ علمی دنیا کو مسلسل فیض یاب کرتے رہتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع پر معلومات کا ایک ذخیرہ سا فراہم کر دیتے ہیں۔ انھیں ریزہ ریزہ جمع کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ ان کے نتائجِ فکر سے اگر کوئی شخص اتفاق نہ بھی کر سکے تو ان کی وسعتِ مطالعہ کا انکار نہیں کر سکتا۔

'عہدِ نبوی میں تنظیم حکومت و ریاست' کے عنوان سے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی ایک ضخیم کتاب پہلے نقوش لاہور کے رسول نمبر میں اور بعد میں ہندوستان سے شائع ہو چکی ہے۔ اہلِ علم نے اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا اور اسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ پیش نظر اس مختصر تصنیف کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس میں اصل ضخیم کتاب کے تمام اہم نکات آ گئے ہیں۔ کتاب کا آغاز عہدِ رسالت میں ریاست کے تدریجی ارتقا سے ہوا ہے پھر آپ کے دورِ مبارک کے شہری نظم و نسق، فوجی، مالی اور مذہبی نظام سے بحث ہے۔ ان موضوعات سے ہماری کتبِ سیرت میں بہت کم تعرض کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے کتاب میں جدّت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں ہماری علمی تاریخ میں جن موضوعات پر بہت زیادہ کام ہوا ہے ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ بھی ہے۔ اس پر بڑا وسیع اور قیمتی لٹریچر موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تکمیل ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس منارۂ نور سے اکتساب فیض کا سلسلہ جاری ہے، اسے جاری رہنا چاہیے اور امید ہے قیامت تک جاری رہے گا۔ ابھی سیرت کے بے شمار گوشے اہلِ علم کی توجہ چاہتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میری خواہش اور تحریک پر اس کتاب کے ذریعہ سیرت مقدسہ کے بعض اہم گوشے ابھر کر سامنے آ گئے۔ اس کے لیے میں مصنف محترم کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو شرف قبولیت سے نوازے اور اس کارِ خیر کی تحریک کا اس سیہ کار کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین ومن تبعہ الی یوم الدین

رسولِ اکرم حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت وعقیدت کی دولت بابا جان گرامی الحاج انعام علی مرحوم سے خون کی وراثت میں ملی تھی اس کو مزید جلا ان کی تعلیم وتربیت سے ملی۔ سیرتِ نبوی نصابی اور خارجی دونوں مطالعات میں ہمیشہ شامل رہی۔ رسمی تعلیم کی دستاویزی تکمیل کے بعد تدریس کی نوبت آئی تو اس کی سب سے بڑی سعادت سیرتِ نبوی کی تعلیم تھی۔ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کے شوق وذوق اور ضروریات نے بزرگوں اور استادوں کے ارشاد میں اور شدت پیدا کی اور اپنی طلبِ سعادت نے بھی مہمیز کیا۔ نتیجہ میں میری اولین انگریزی کتاب سیرتِ نبوی پر لکھی گئی اور اس کا اردو روپ "عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت" کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ موجودہ کتابچہ اسی موضوع پر ایک مختصر تحریر ہے جو برادر مکرم مولانا سید جلال الدین عمری کے محبت آگیں حکم پر پہلے چار اقساط میں تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ میں پیش کی گئی اور انھیں کے علم پرور ارشاد پر یہ مجموعہ کتابی صورت میں حاضرِ خدمت ہے۔

سیرتِ نبوی اور اس کے گوناگوں پہلوؤں پر تالیفات کا سلسلۂ زریں قیامت تک جاری رہے گا۔ خوش بخت ہوں کہ اس سعادت سے بہرہ ور ہونے کی مسرت میرے نصیب میں بھی آئی۔ لیکن دراصل اس کا ثواب میرے قبلہ گاہی، اساتذۂ کرام اور مولفینِ سیرت کو نذر کرنا چاہیے جنھوں نے مجھ بے مایہ کو اس دولتِ کونین سے نوازا۔ اس کتاب کے حوالہ سے میں مولانا سید جلال الدین عمری صاحب کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ وہ کئی برسوں

سے برابر اس کو مرتب کرنے کا تقاضا کرتے رہے اور یارانِ کار مجھ کو بہرہ مند بنانے کا باعث بنے اس لیے یہ کتاب ان کے نام معنون ہے۔

قارئینِ گرامی سے گذارش یہ ہے کہ اس کتاب کو توجہ اور محبت سے پڑھیں اور سیرتِ نبوی کے اس اہم اور شاندار پہلو سے نہ صرف آگہی حاصل کریں بلکہ دوسرے پہلوؤں کے مطالعہ سے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایمان وعمل کی حرارت پیدا کریں اور میری غلطیوں سے مجھے براہ راست آگاہ کریں تاکہ ان کی اصلاح کرسکوں۔

آخر میں اپنے تمام اہل خانہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی محبت واحسان سے زندگی کو مسرت آگیں بنایا اور برادرم احراز الحسن جاوید کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے میری تحریر کو حسنِ کتابت سے آراستہ کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو مقبول اور ہم سب کو اسوۂ نبوی کا پابند بنائے۔

محمد یٰسین مظہر صدیقی

'الامین' ۴/۴۴، احمد نگر، علی گڑھ

۲/۱۰/۱۹۹۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریاست کا ارتقاء

اسلامی نظامِ حیات دین و دنیا کی تفریق نہیں کرتا۔ انسانی اعمال کی کسوٹی نیت کے بخیر ہونے کی عظیم حقیقت ہے۔ نیت صحیح ہے تو دنیا بھی دین اور نیت غلط ہے تو دین بھی دنیا۔[۱] یہی بنیادی سبب ہے جو اسلام اور دین کو پوری انسانی زندگی، بلکہ پوری کائنات کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر حاوی بناتا ہے۔[۲] زندگی اور فکر کے دوسرے نظاموں اور سلسلوں کو ماننے والے اور دین کی اصل حقیقت سے بے خبر غیر مسلم ہی نہیں مسلمان بھی جب اس حقیقتِ اصلی کا ادراک نہیں کر پاتے تو وہ اسلامی نظامِ حیات کی پہنائیوں اور گہرائیوں کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

جس طرح اسلام عقائد و ایمانیات اور عبادات یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان تعلقات کا نظام پیش کرتا ہے اسی طرح دنیاوی معاملات یعنی بندوں کے باہمی تعلقات کا نظام بھی عطا کرتا ہے۔ انسانی معاملات و تعلقات گرچہ باہم مربوط و متحد ہیں تاہم تفہیم و تسہیل کے لیے ان کو سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی نظاموں کے الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نظام کے لیے اسلام نے تمام ضروری اور محکم اصول بیان کر دئے ہیں۔ اسوۂ نبوی نے ان کی عملی فروعات بھی تشکیل دے دی ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفاء عظام اور ان کے اہلِ علم و عمل پیرو کاروں نے ان پر حالات و زمانے کی رعایت سے عمل کر کے بھی دکھا دیا ہے۔[۳]

بلاشبہ اسلام اور دین بھی ہر قانونِ الٰہی کی طرح اپنی اندرونی ترجیحی ترتیب پر درجہ بدرجہ قائم و مرتب ہے اس میں اساسی اور بنیادی اہمیت ایمانیات و عقائد کو حاصل ہے

ان میں بھی توحیدِ الٰہی اصل الاصول ہے جس سے رسالت اور آخرت کے دوسرے دو بنیادی عقیدے پھوٹتے ہیں اور پھر انھیں تینوں بنیادی عقیدوں کے ذیلی عقیدے جیسے ملائکہ، کتابوں، حشر نشر، جنت و جہنم، تقدیر وغیرہ آتے ہیں۔ یہی ترجیحی درجہ بندی عبادات میں پائی جاتی ہے کہ اصل عبادت نماز و صلوٰۃ ہے جو علامتِ اسلام ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ، صوم و روزہ اور حج وغیرہ اس کے بعد آتے ہیں کہ وہ زمان و مکان اور بعض دوسری چیزوں سے بھی مشروط ہیں[۵۴]

عقائد و ارکانِ اسلام کے بعد اخلاق و معاملات کا درجہ آتا ہے[۵۵] اور اس میں بھی پہلے انفرادی اخلاق و معاملہ کا مرتبہ ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے فرضِ عین ہے پھر اجتماعی اخلاق و معاملہ کا مقام ہے کہ وہ پوری امت و ملت سے متعلق ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر حالات میں وہ فرضِ کفایہ بن جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی نظامِ حیات میں زندگی تمام فطری اور قدرتی کارخانوں کی مانند اپنے گول مدار پر محوِ خرام رہتی ہے کہ ایمان و اسلام سے شروع ہوتی، ارکان و عبادات میں متشکل ہوتی اور معاملات و اخلاقیات میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر پہلی چیز دوسرے کی عامل اور ہر دوسری چیز پہلی کی متقاضی ہوتی ہے۔ ایمان و عمل اور اخلاق کی لڑی میں ہر ایک حلقہ دوسرے کا معاون و مددگار ہوتا ہے۔

عقائد ارکان کا تقاضا کرتے ہیں اور ارکان معاملات و اخلاق کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی تقاضا در تقاضا اور طلب در طلب کے نتیجہ میں سماجی نظام یا معاشرہ وجود میں آتا ہے اور اس معاشرۂ اسلامی کا ایک نظام اگر سیاسی ہے تو دوسرا اقتصادی اور تیسرا تہذیبی۔ اس طرح یہ تمام نظام مل کر بزرگ ترامت کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسلامی نظامِ حیات کی ایک مثال انسانی جسم سے بھی دی جا سکتی ہے کہ قلب و دماغ اگر ایمان و عقیدہ ہیں تو اعضاء و جوارح اور پورا بدن ارکان و معاملات ان میں سے جو عضو کم یا ناقص ہوگا اتنا ہی اس کا جسمانی نظام ناقص یا کمزور ہوگا۔ اسی لیے سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی نظام بھی اسلامی نظامِ حیات کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام و مرتبہ اور مقتضا کے مطابق اتنا ہی ضروری اور لازمی ہے یہی دین اور اسلام کا صحیح تصور ہے[۵۶]

پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی لیے ہوئی تھی کہ آپ کے مبارک

ہاتھوں سے دینِ اسلام کی ارتقار پذیر عمارت کی تکمیل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان، عبادت اور معاملت کا جو اصولی نظام اپنے کلام پاک۔ قرآن مجید۔ میں مجمل و کامل طور سے بیان فرمایا اس کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث و سنن کے ذریعہ مفصل و مشرح کیا اور نظریاتی اور عملی دونوں لحاظ سے اس کو مستحکم و استوار کیا۔ بیان و تشریح اور تکمیل و استواری کا عمل تدریجی قانونِ ارتقار کے مطابق اولین وحیِ الٰہی کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ۶۱۰ء سے شروع ہوا اور مختلف مراحل و درجات سے گذرتا ہوا مدینۂ منورہ میں آپ کی حیاتِ مستعار کے آخری لمحات کے ساتھ ۶۳۲ء میں تکمیل کو پہونچا۔[۵]

ایمانیات اور ارکان و عبادات کی مانند رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرہ اور اس کے مختلف نظاموں کی تشکیل بھی مکہ مکرمہ کے اپنے قیام کے زمانے ہی میں شروع کردی تھی۔ نمازِ با جماعت کا قیام، دارِ ارقم میں مرکزِ اسلامی کا انتظام، معتد بہ تعداد ہو جانے پر مکی مسلمانوں میں اسلامی مواخاۃ (بھائی چارہ) کی قانونی اور دستوری استواری، اللہ اور اس کے رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت و فرمانبرداری، مواساۃ و مواخاۃ کیلیے صدقہ و زکوٰۃ کی فرضیت، اور متعدد دوسرے سماجی اور اقتصادی احکام و اعمال نے مکہ مکرمہ ہی میں ایک اسلامی معاشرہ اور امت کی تشکیل کردی تھی جو نہ صرف قریشی معاشرہ سے ممتاز و منفرد تھی بلکہ اس کی متوازی بھی تھی، اور تمام اسلامی گوشوں میں مشترک بھی۔[۶]

مکی دور میں اسلام اور امتِ اسلامی کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی نظریات نہ صرف واضح ہوئے تھے بلکہ انھوں نے عمل کی ٹھوس صورتیں بھی اختیار کرنی شروع کردی تھیں جس طرح سماجی اور اقتصادی زندگی میں ماکولات و مشروبات، رہن سہن، لباس و وضع قطع، آدابِ نشست و برخاست اور دوسرے مظاہر نے مکہ اور قریش کی سماجیات و اقتصادیات سے امتیاز پیدا کیا تھا اسی طرح اسلامی اجتماعیت، اللہ و رسول کی ہر معاملہ میں غیر مشروط اطاعت اور سب سے بڑھ کر عقیدۂ توحید نے اسلام کی سیاسی زندگی اور مضمرات کو آشکار کر کے روبہ عمل لانے کا سلسلہ جاری کردیا تھا۔ اسلام کے انھیں سیاسی مضمرات اور اعمال نے عرب کے دور اندیش افراد و طبقات کو اسلام کے سیاسی غلبہ اور اظہار کا احساس بھی دلایا تھا۔ بلکہ

اس سے خوفزدہ بھی کر دیا تھا۔[۹]

بعثتِ نبوی کے پہلے تیرہ برسوں میں اسلامی سیاسی نظام نے مکہ مکرمہ میں جو برگ و بار پیدا کیے تھے وہ مدینۂ منورہ میں ابتدا ہی سے پروان چڑھنے اور پھل پھول لانے لگے۔ مکہ مکرمہ میں قریشی سیاسی نظام کی بالادستی نے اسلامی نظامِ سیاست کو پوری طرح پھولنے پھلنے نہ دیا تھا مگر مدینۂ منورہ میں ایسی کوئی بالادستی نہ تھی اور اگر تھی تو اسلامی بالادستی تھی۔ ہجرتِ نبوی کے معًا بعد وہ مسجدِ نبوی کی تعمیر، مواخاۃِ مہاجرین و انصار اور دستورِ مدینہ کے ذریعہ شہرِ نبوی کے مسلم و غیر مسلم طبقات کی ہم آہنگی کی صورت میں مستحکم ہوئی اور مدینہ منورہ کی شہری ریاست وحکومت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔

پوری نوعِ انسانی کی فلاح اور ساری کائنات کی بہبود کے مقصودِ اعلیٰ کے سبب مدینہ کی شہری ریاست قرب وجوار کے قبائل اور علاقوں میں اپنی ابتدائی مہمات۔ غزوات وسرایا۔ کی مصالحانہ اور پرامن مساعی کے ذریعہ وسیع ہوئی۔ مخالف قبائلِ عرب کی جارحانہ کارروائیوں اور قریشِ مکہ کی معاندانہ سرگرمیوں نے مدنی اسلامی ریاست کو تلوار اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ حکمِ الٰہی، وقتی تقاضے اور حالات کے دباؤ نے مدینہ کی شہری ریاست کی فوجی طاقت بڑھائی جس نے غزوات وسرایا میں قریشِ مکہ اور قبائلِ عرب کو شکست دے کر اسلامی ریاست کی حدود وسیع کرنی شروع کر دیں۔ زیرِ زمین اسلام کی کشش برابر کام کرتی رہی۔ فتوحاتِ خیبر و فدک وغیرہ نے شمال میں اور فتوحاتِ مکہ و حنین وغیرہ نے جنوب و مشرق میں اس کی سرحدیں دور دور تک پھیلا دیں۔ ان کے بعد پورے عرب نے اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر کے اسلامی ریاست کو پورے جزیرہ نمائے عرب پر وسیع کر دیا۔[۱۰]

شہری نظم و نسق

مدینہ منورہ کی شہری ریاست دس برس کے قلیل عرصہ میں ارتقا کی مختلف منزلیں طے کر کے ایک عظیم اسلامی ریاست بن گئی جس کے حدودِ حکمرانی شمال میں عراق و شام کی سرحدوں سے لے کر جنوب میں یمن و حضر موت تک، اور مغرب میں بحرِ قلزم سے لے کر مشرق میں خلیجِ فارس و سلطنتِ ایران تک وسیع ہو گئیں اور عملی طور سے پورے جزیرہ نمائے عرب پر اقتدارِ نبوی قائم ہو گیا۔[۱۱]

اگرچہ شروع میں اسلامی ریاست کا نظم و نسق عرب قبائلی روایات پر قائم و استوار تھا تاہم جلد ہی وہ ایک ملک گیر ریاست اور مرکزی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔[۱۲] یہ عربوں کے لیے ایک بالکل نیا سیاسی تجربہ تھا کیونکہ قبائلی روایات اور بدوی فطرت کے مطابق وہ قبائلی سیاسی اکائیوں میں منقسم رہنے کے عادی تھے۔ یہ سیاسی اکائیاں آزاد و خود مختار ہوتی تھیں جو ایک طرف قبائلی آزادی کے تصور کی علمبردار تھیں اور دوسری طرف سیاسی افراتفری اور اس کے نتیجہ میں مسلسل سیاسی چپقلش، فوجی تصادم اور علاقائی منافرت کی بھی ذمہ دار تھیں۔ عربوں میں نہ صرف مرکزیت کا فقدان تھا بلکہ وہ مرکزی اور قومی حکومت کے تصور ہی سے عاری تھے کروہ ان کی من مانی قبائلی آزادی کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ وہ کسی "غیر" کی حکمرانی تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے۔[۱۳] یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سیاسی معجزہ ہے کہ آپ نے مرکزیت دشمن قبائلِ عرب کو ایک سیسہ پلائی ہوئی امت میں تبدیل کر دیا اور ان کی ان گنت سیاسی اکائیوں کی جگہ ایک مرکزی حکومت قائم کر دی جس کی اطاعت بدوی اور شہری تمام عرب کرتے تھے۔ اس کا سب سے بڑا بلکہ واحد سبب یہ تھا کہ اب "قبیلہ یا خون" کے بجائے "اسلام یا دین" معاشرہ و حکومت کی اساس تھا۔[۱۴] اسلامی حکومت کی سیاسی آئیڈیالوجی اب اسلام

اور صرف اسلام تھا۔ جن کو اس سیاسی نصب العین سے مکمل اتفاق نہیں تھا ان کے لیے بھی بعض اسباب سے اس ریاست کی سیاسی بالادستی تسلیم کرنی ضروری تھی۔ یہ ناگزیر حقیقت بہرکیف سب کو تسلیم کرنی پڑی تھی کہ اسلامی ریاست کا اقتدار اس کے تمام باشندوں کے لیے لازمی تھا۔ اکثر لوگوں نے مذہبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اور بعض طبقات نے صرف سیاسی لحاظ سے اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کی تھی۔[۱۵]

تنظیمی ڈھانچہ

تنظیمی ڈھانچے کے اعتبار سے نبوی حکومت کا نظم و نسق درجہ بدرجہ تین سطحوں پر قائم نظر آتا ہے: (۱) مرکزی (۲) صوبائی اور (۳) مقامی۔

ریاست میں اقتدار و اختیار کا سرچشمہ ذاتِ نبوی تھی کہ اس کے ہاتھ میں مرکزی حکومت کی باگ ڈور تھی۔ مستعد کارگزاری کے لیے سربراہِ حکومت اپنے کچھ اختیارات مرکزی، صوبائی اور مقامی حکام کو منتقل کر دیتے تھے۔ تینوں سطحوں کے حکام کی تقرری و تبدیلی اور معزولی کا کلی اختیار سربراہِ مملکت کو آئینِ الٰہی کے مطابق بلاحجت و تکرار حاصل تھا۔ مرکزی انتظامیہ میں نائبینِ نبوی، مشیرانِ گرامی، کاتبینِ کرام، سفیرانِ رسالت، عہدہ دارانِ خاص اور شعراء و خطباءِ عظام کے علاوہ متعدد ثانوی کارکنانِ حکومت شامل تھے جبکہ صوبائی انتظامیہ میں ولاۃ (گورنر) ولایات اور ان کے ماتحت حکام شامل تھے۔ مقامی نظم و نسق کی سطح پر شیوخِ قبائل، مقامی منتظمین، نقیبانِ شہرِ نبوی، قضاۃ کرام اور افسرانِ بازار وغیرہ شامل تھے۔[۱۶] ذیل میں ہم انہیں افسروں اور حاکموں کی تقرری، معزولی اور تبدیلی کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمتِ عملی کا جائزہ لیں گے۔

نائبینِ نبوی

سیاسی اور انتظامی اہمیت کے اعتبار سے پہلا مقام نائبینِ نبوی کو حاصل ہے۔ مآخذ سے یہ اہم حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اور کسی سبب سے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنے پیچھے ایک جانشین (نائب/خلیفہ) چھوڑ جاتے۔ روایات کے بعض فقروں سے یہ غلط فہمی کچھ حلقوں میں پیدا ہو گئی ہے کہ نائب

رسول کا کام صرف نماز کی امامت کرنا تھا[18]۔ حالانکہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ آپ کی غیر حاضری میں شہر مدینہ اور مرکزی حکومت کے تمام انتظامی معاملات کا نگراں اور ذمہ دار ہوتا تھا۔ نماز کی امامت دراصل "قیادتِ کلی" اور "نیابتِ تام" سے کنایہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے مصادر سے "نائبِ رسول" کے اختیارات و فرائض کا علم واضح طور سے نہیں ہوتا لیکن ذیل کے تاریخی تجزیے سے اس عہدۂ جلیلہ کی حقیقت اور اس پر فائز کارکنوں کے فرائض و اختیارات کی ماہیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

عہدِ نبوی میں اس عہدہ پر کل تیئس[23] تقرریاں کی گئیں جبکہ نائبینِ رسول کی کل تعداد صرف تیرہ[13] تھی یعنی بعض خوش بخت صحابۂ کرام کو یہ سعادت بار بار ملی تھی[19]۔ تاریخی اور توقیتی ترتیب کے مطابق پہلے غزوۂ ودان کے زمانے میں حضرت سعد بن عبادہؓ خزرجی کو اور اس کے بعد غزوۂ بواط کے دوران حضرت سعد بن معاذؓ اوسی کو یہ عہدہ ملا تھا[20]۔ مدینہ کے دو عظیم ترین مقامی شیوخِ قبیلہ کی یکے بعد دیگرے تقرری دراصل فراستِ نبوی، حکمتِ عملی اور دوراندیشی کی دلیل تھی کہ شہرِ نبوی کے دونوں اہم ترین مقامی طبقات ــــ خزرج و اوس ــــ کی اس طرح نہ صرف دل جوئی کی گئی تھی بلکہ ان کو حکومتِ اسلامی میں برابر کا شریک و سہیم ہونے کا احساس دلا کر ان کی مکمل وفاداری اور اطاعت بھی حاصل کر لی گئی تھی۔ تیسری تقرری کا شرف حضرت زید بن حارثہ کلبیؓ کو غزوۂ سفوان اولیٰ کے دوران حاصل ہوا[21]۔ یہ تقرری نہ صرف امتِ اسلامی کے تمام ارکان کی معاشرتی و سیاسی مساوات کی دلیل ہے بلکہ خاندانی شرف و نجابت پر فخر کرنے والے عربوں کے نظریۂ نجابت کے لیے قاطع برہان بھی تھی۔ اس تقرری نے ثابت کر دیا تھا کہ صلاحیت و لیاقت ہی بنائے تقرری تھی نہ کہ قرابت و خون کی رشتہ داری یا محض خاندانی وجاہت و نجابت۔ حکمتِ نبوی کا ایک مظاہرہ چوتھی تقرری میں ہوا جب ایک مولا اور غلام کے بعد غزوۂ ذات العشیرہ کے دوران ایک قریشی حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد مخزومی کو نائبِ رسول کا عہدہ عطا کیا گیا۔ صحابیٔ موصوف آپ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے[22]۔ حضرت زید بن حارثہ کو دوبارہ یہ خدمت غزوۂ مریسیع کے دوران تفویض ہوئی[23]۔

غزوۂ بدر کے دوران خلفاءِ رسول کی تقرری کے منہاج و مقصد پر کافی روشنی مصادر

سے حاصل ہوتی ہے ابن اسحاق اور ان کے جامع ابن ہشام کا بیان ہے کہ پہلے اس عہدہ پر حضرت عمرو بن ام مکتوم عامری قریشی کی تقرری عمل میں آئی تھی مگر پھر کچھ مصالح کے پیش نظر ان کی جگہ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذر خزرجی کو مقرر کیا گیا۔[۲۲] بعض ماخذ کے مطابق حضرت ابن ام مکتوم کے بجائے حضرت عاصم بن عدی اوسی کا پہلے تقرر ہوا تھا اور پھر ان کی جگہ حضرت ابولبابہ نے سنبھال لی۔ تمام روایات کی تنقیح کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ اس موقع پر کم از کم تین حضرات کو شہر کے مختلف علاقوں کی انتظامی ذمہ داری سونپی گئی تھی: حضرت ابولبابہ خاص شہر رسول کے لیے نائب مقرر کیے گئے تھے جبکہ حضرت عاصم بن عدی عجلانی اوسی شہر کے بالائی علاقے (العالیہ) کے اور حضرت حارث بن حاطب خزرجی اپنے قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے معاملات و امور کے نگراں تھے۔ حضرت ابولبابہ کو غزوات بنی قینقاع و سویق میں دو بار مزید خلافت نبوی کی سعادت ملی۔ اس طرح مجموعی طور سے ان کی تقرریوں کی تعداد تین ہو گئی۔[۲۵]

خلفاء و نواب رسول کے اس طبقہ میں سب سے اہم شخصیت حضرت عمرو بن ام مکتوم کی ہے جنھوں نے روایات کے اختلاف کے مطابق بارہ یا تیرہ مواقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کا فریضہ انجام دیا تھا۔ اگرچہ بدر کبریٰ کے موقع پر بروایت ابن اسحاق ان کی تقرری عارضی ثابت ہوئی تاہم غزوۂ کدر سے فتح مکہ تک پانچ برس کے دوران ان کو یہ سعادت بار بار ملتی رہی۔ مذکورہ مواقع کے علاوہ غزوات بحران، احد، حمراء الاسد، بنی نضیر، خندق، بنو قریظہ، لحیان، غابہ، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین اور طائف کے زمانے میں ان کی تقرری ہوتی رہی۔[۲۶] اسی اثناء میں حضرات عثمان بن عفان اموی[۲۷]، عبداللہ بن رواحہ خزرجی[۲۸]، سباع بن عرفطہ غفاری[۲۹] اور ابو رہم غفاری[۳۰] کی بالترتیب غزوات ذو امر اور ذات الرقاع، بدر الموعد، دومۃ الجندل اور عمرۃ القضیہ میں نیابت رسول سے سرفرازی ہوئی تھی۔ ان میں سے حضرت عثمان کو پہلے دو غزوات کے زمانے میں دوبارہ یہ موقع ملا تھا اسی طرح حضرت سباع غفاری کو دو بار مزید خیبر، فدک و وادی القریٰ اور حجۃ الوداع کے زمانے میں یہ سعادت ملی۔ حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کو غزوۂ تبوک کے دوران یہ شرف ملا جبکہ اسی زمانے میں حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کے نصیب میں خاندان رسالت کے امور کی دیکھ بھال کی سعادت آئی۔[۳۱]

مذکورہ بالا تیرہ[۱۳] نائبین رسول میں سے حضرت ابن ام مکتوم عامری قریشی کو بارہ[۱۲] یا تیرہ[۱۳] مرتبہ اس عہدہ سے سرفراز کیا گیا جبکہ حضرات عثمان بن عفان اموی، زید بن حارثہ کلبی اور ابوسلمہ مخزومی کو دو دو بار یہ سعادت ملی۔ حضرات ابولبابہ اور سباع بن عرفطہ غفاری کی تین بار سرفرازی ہوئی اور بقیہ سات[۷] حضرات کو محض ایک بار موقعہ ملا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نائب رسول کا عہدہ تو مستقل تھا مگر عہدیدار اور ان کی تقرریوں کی نوعیت عارضی تھی۔ قبائلی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ تقرریاں یعنی سترہ[۱۷] قریش کو ملی تھیں۔ ان میں اہم ترین حصہ بنو عامر بن لوی کا تھا جبکہ بنو امیہ اور بنو مخزوم کے بطون کو صرف دو[۲] دو[۲] تقرریوں سے نوازا گیا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے پھر اوس کا نمبر آتا ہے جس کے پانچ[۵] ارکان نے سات[۷] بار سعادت حاصل کی۔ ان کے بعد غفار کا درجہ ہے جن کے دو عہدیداروں نے چار مرتبہ یہ خدمت انجام دی۔ کلب اور خزرج کے حصہ میں صرف دو[۲] بار خلافت آئی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاقائی نمائندگی کے لحاظ سے مرکزی عرب کے قریش و انصار نے غالب تر حصہ پایا تھا جبکہ دوسرے قبائل میں صرف مغربی حصہ کے ایک قبیلہ غفار کو نمائندگی ملی تھی۔ شمالی عرب کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی اور جنوبی، مشرقی اور بقیہ عرب کے قبائل کی نمائندگی بالکل صفر تھی۔

قبول اسلام کے اعتبار سے خلفاء رسول کی غالب اکثریت اگرچہ سابقین اولین میں سے تھی مگر انصار کے تمام افراد کا تعلق مدنی عہد سے تھا۔ ان میں ایک دو[۲] کے سوا بقیہ سے کہیں زیادہ قدیم مسلمان موجود تھے مگر ان کو یہ عہدہ کسی سبب سے نہیں عطا ہوا۔[۳۲]

تمام اکابر قریشی صحابہ جیسے حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ، طلحہؓ، زبیر اور حمزہؓ وغیرہ کو اس طبقہ میں کوئی جگہ نہیں ملی۔ مدت عہدہ پانچ دن سے لے کر تقریباً تین[۳] ماہ تک غزوات کی نوعیت کے مطابق مختلف رہی۔[۳۳] بہ اعتبار عمر سب ہی جوان طبقہ کے لوگ تھے اور ان میں سب سے معمر حضرت عثمان اموی تھے جن کا شمار ادھیڑ عمر والوں میں کیا جاسکتا ہے۔[۳۴]

مشیرانِ نبوی :۔ شوریٰ

سیاسی اہمیت اور انتظامی خصوصیت کے لحاظ سے دوسرا طبقۂ عمال مشیروں پر مشتمل تھا۔ حکمِ الٰہی بھی ہے[۳۵] اور سنتِ نبوی بھی کہ اسلامی حکومت کے تمام امور مسلمانوں کے باہمی مشاورت سے طے کیے جائیں۔ حکومتِ نبوی کی ایک اہم خصوصیت شوریٰ بھی قرار دی گئی ہے[۳۶] اور مآخذ میں خاص کر سیرتی ادب میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں بیشتر کا تعلق فوجی امور سے ہے، اگرچہ کچھ گنی چنی مثالیں مذہبی، اقتصادی اور انتظامی معاملات سے متعلق بھی مل جاتی ہیں۔

نبوی مشاورت اور مشیرانِ کرام

شوریٰ کی پہلی نبوی مثال تاریخی ترتیب کے مطابق ایک مذہبی معاملہ سے متعلق ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ہجرت کے معاً بعد نماز کے لیے بلانے کے طریقہ پر آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا۔ متعدد رائیں دی گئیں اور بالآخر فیصلہ مروجہ اذان کے کلمات پر ہوا جس کی رائے بہ اختلافِ روایات حضرات عبداللہ بن زید انصاری اور عمر بن خطاب عدوی قریشی کے علاوہ متعدد دوسرے اصحاب نے دی تھی۔[۳۷] مدینۂ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے جگہ کا انتخاب صلاح و مشورہ کے بعد ہی ہوا تھا۔[۳۸] مواخاۃ کا نظام بھی طرفین کی مرضی اور باہمی مشاورت سے قائم کیا گیا تھا۔[۳۹]
مدینہ کے یہودی قبائل کی مفتوحہ آراضی کی تقسیم انصار کے مشورہ و مرضی سے عمل میں آئی تھی۔[۴۰] بحرین میں جب انصارِ مدینہ کو آراضی کے قطائع دیئے گئے تو انھوں نے اپنے جذبۂ اخوت سے سرشار ہو کر اس وقت تک لینے سے انکار کیا جب تک ان کے مہاجر بھائیوں کو بھی اسی قدر نہ دیے جائیں۔[۴۱]

واقعۂ افک کے سلسلہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابۂ کرام سے صلاح و مشورہ کیا تھا۔[۴۲] پردہ کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ برابر مشورے دیتے رہے تا آنکہ وہ بالآخر قانونِ الٰہی بن کر نافذ و جاری ہوئے۔[۴۳] صلحِ حدیبیہ کے دوران ایک نازک موقع پر حضرت ام سلمہ کا مشورہ دربارِ نبوی میں مقبول ہوا۔[۴۴] جنگِ خیبر میں مسلم عورتوں کو ان کی شدید خواہش و اصرار

پر شرکت کی اجازت دی گئی۔[۴۵] فتح مکہ کے موقع پر حضرات ابوسفیان بن حرب اموی اور عکرمہ بن ابی جہل مخزومی وغیرہ متعدد اشراف کی جان بخشی کی سفارش بعض دوراندیش مسلمانوں نے کی تھی۔[۴۶] جبکہ حضرت ابوسفیانؓ کے گھر کو دارالامان قرار دینے کا مشورہ حضرت عباسؓ ہاشمی نے دیا تھا۔[۴۷] واقعۂ ایلاء کے سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا اسمِ گرامی بطور مشیرِ نبوی نظر آتا ہے۔[۴۸] معاہدات کے سلسلہ میں غزواتِ خندق و خیبر کے دوران انصار کے بعض سرداروں سے مشورہ کا ذکر ملتا ہے۔[۴۹]

جنگی مشاورت

حربی امور کے سلسلہ میں مشوروں اور ان کے مشیروں کے اسمائے گرامی کا ذکر خاص صراحت کے ساتھ ملتا ہے۔ غزوۂ بدر سے قبل جب قریشِ مکہ کی فوج کی آمد کی خبر ملی تو اسلامی شوریٰ منعقد ہوئی اور حضرات ابوبکر وعمر و مقداد بن عمرو خزاعی نے مہاجرین میں سے اور حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور حباب بن منذر خزرجی نے انصار میں سے آپ کے منصوبۂ جنگ کی بھرپور حمایت کی۔[۵۰] میدانِ بدر میں موجود کنوؤں کو اندھا کرنے کا مشورہ مشہور ماہرِ حرب حضرت حباب بن منذر خزرجیؓ نے دیا۔[۵۱] جنگِ بدر کے قریشی قیدیوں کے سلسلے میں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے مختلف مشورے دئیے جن میں سندِ قبول اول الذکر کے مشورہ کو ملی۔[۵۲]

غزوۂ احد کے موقع پر اس مسئلہ پر شوریٰ ہوئی کہ جنگ مدینہ میں محصور ہو کر لڑی جائے یا کھلے میدان میں مقابلہ کیا جائے۔ بشمولِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم متعدد بلکہ بیشتر اکابر و اہلِ رائے صحابہ کی رائے پہلی تجویز کے حق میں تھی جبکہ متعدد صاحبِ رائے اور پُرجوش صحابہ خصوصاً حضرات حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، سعد بن عبادہ خزرجی، نعمان بن مالک، مالک بن سنان، ایاس بن اوس، خیثمہ بن حارث اور انس بن قتادہ دوسری رائے کے حق میں تھے اور انھیں کے اصرار پر فیصلہ بھی ہوا۔[۵۳]

ایک بڑی سازش کے خاتمہ اور اسلامی ریاست کے خطرناک دشمن کعب بن اشرف کے قتل کے سلسلہ میں حضرت محمد بن مسلمہ اوسی سے رائے طلب کی گئی تھی۔[۵۴] مشہور

واقعہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی نے جنگِ خندق کے موقع پر شہر کے گرد خندق کھودنے کا مشورہ دیا تھا۔[۵۵] محاصرہ کے جلد خاتمہ اور احزاب کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کے لیے غطفان کے سرداروں کو مدینہ کی نصف پیداوار دے کر واپس جانے پر راضی کرنے کی تجویز پر شوریٰ ہوئی جس میں حضرات سعد بن معاذ اوسی، اسید بن حضیر اوسی اور سعد بن عبادہ خزرجی نے تجویز کی مخالفت کی اور وہ بالآخر مسترد ہو گئی۔[۵۶] اسی طرح کی دوسری تجویز جنگِ خیبر کے دوران آئی جو انھیں سرداروں نے مسترد کرا دی۔[۵۷] صلحِ حدیبیہ کے سلسلہ میں قریش سے گفت و شنید کے لیے حضرت عثمان بن عفان اموی کی بطور سفیرِ نبوی تقرری حضرت عمرؓ فاروق کے مشورے سے ہوئی۔ غزوۂ خیبر میں حضرت حبابؓ کی رائے پر پہلے بعض درختوں کے کاٹنے کا حکم صادر ہوا تھا جو کچھ دیر بعد حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ پر منسوخ کر دیا گیا۔[۵۸]

مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ جنگی معاملات میں اکثر و بیشتر حضرت حباب بن منذر خزرجی کے مشورے کو شرفِ قبول ملتا تھا۔ چنانچہ بدر، خندق، خیبر اور طائف وغیرہ کے مواقع پر مسلم خیمہ گاہ کے سلسلے میں ان کی رائے حتمی سمجھی گئی۔ ایک موقع پر حضرت بشیر بن سعد خزرجی کی بطور امیرِ سریہ تقرری حضرات شیخین کے متفقہ مشورہ پر ہوئی[۵۹] جبکہ حنین کے دوران طریقِ جنگ پر حضرت عمر فاروق نے اور محاصرۂ طائف کے دوران منجنیق کے استعمال پر حضرت سلمان فارسی نے مشورہ دیا تھا[۶۰] اور حضرت نوفل بن معاویہ دئلی کے مشورہ پر اس کا محاصرہ اٹھایا گیا تھا۔[۶۱] اسی طرح تبوک سے واپسی کا نبوی فیصلہ فاروقی مشورہ سے ہوا تھا۔[۶۲]

مشیروں کا تجزیہ

مشیروں کے طبقۂ عمال میں لگ بھگ پچاس[۵۰] صحابۂ کرام کے اسماءِ گرامی ملتے ہیں جن میں بعض صحابیات بھی شامل ہیں۔ استقصاء سے اور بھی نام مل سکتے ہیں۔ نبوی شوریٰ دراصل تمام مسلمانوں کے لیے اصولاً کھلی ہوئی تھی مگر آپ عموماً مشورہ اہلِ رائے حضرات ہی سے لیتے تھے۔ اس میں مہاجرین و انصار کے تمام اکابر صحابہ شامل تھے۔ زمانۂ قبولِ اسلام کے لحاظ سے ان میں سابقینِ اولین بھی شامل تھے اور متاخرین بھی۔ خاص بات یہ کہ ان کی اکثریت جوانوں پر مشتمل تھی جبکہ

بزرگوں میں سے صرف دو چار نام نظر آتے ہیں۔ علاقائی اور قبائلی نمائندگی کے لحاظ سے ان کی غالب اکثریت کا تعلق وسطی عرب کے قبائل قریش وانصار سے تھا۔ ان میں بعض موالی بھی شامل تھے اور ان کی حیثیت کسی اعتبار سے بھی فروتر نہیں تھی۔[۶۵]

کُتّابِ نبوی

حکومتِ نبوی کے انتظامی کارپردازوں میں کاتبینِ نبوی کو بڑی اہمیت حاصل تھی کہ وہ وحیِ الٰہی جو قانونِ اسلامی کا اولین واہم ترین سرچشمہ تھا کے علاوہ معاہدات وخطوط وفرامین کے لکھنے والے اور نبوی انتظامیہ کے سکریٹری تھے۔ متعدد مورخین اور مصنفین کے یہاں ان کی تعداد مختلف ہے۔ ہماری تحقیق وجستجو کے مطابق ان کی کم ازکم تعداد پینتالیس[۴۵] تھی۔ امکان یہ ہے کہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ رہی ہوگی۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ضرورت ہوتی تو آپ موجود لوگوں میں سے کسی سے بھی یہ خدمت لے لیتے۔ البتہ مخصوص اور اہم خدمات کے لیے مخصوص حضرات ہی متعین تھے جیسا کہ حضرات معاویہ بن ابی سفیان اموی اور زبیر بن عوام اسدی وغیرہ کی مثالوں سے معلوم ہوتا ہے۔[۶۶]

کاتبینِ وحی میں حضرات عثمان بن عفان اموی، خالد بن سعید اموی، ارقم بن ابی ارقم مخزومی، علی بن ابی طالب ہاشمی، شرحبیل بن حسنہ کندی، اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری کے اسماء گرامی مکی عہد کے کاتبوں میں گنائے جاتے ہیں۔[۶۷] ان کے علاوہ دوسرے اکابر مکی صحابہ جیسے حضرات شیخین وغیرہ بھی اس سعادت سے یقینی طور پر بہرہ ور ہوئے تھے۔ مدنی عہد میں وحی کے کاتبین تو متعدد تھے مگر کاتبِ اعظم کا عہدہ حضرت ابی بن کعب خزرجی اور ان کے نائب کا منصب حضرت زید بن ثابت خزرجی کو ملا تھا۔ دوسرے بزرگوں میں مکی عہد کے بعض حضرات بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ حضرات معاویہ بن ابی سفیان اموی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی، علاء بن عقبہ، حنظلہ اسیدی، سجل اور ایک نامعلوم نصرانی نومسلم کے علاوہ ابن خطل کے نام بھی کاتبینِ وحی میں گنائے جاتے ہیں۔[۶۸] ظاہر ہے کہ بعض دوسرے حضرات

بھی اس شرف کے مستحق بنے ہوں گے۔

خطوط و فرامین لکھنے والوں میں سرفہرست حضرات علی ہاشمی، ابی بن کعب خزرجی، معاویہ اموی، خالد اموی، مغیرہ ثقفی، علاء بن عقبہ، ارقم مخزومی، ثابت خزرجی، عثمان اموی، شرحبیل کندی، جہیم بن صلت مطلبی، علاء بن حضرمی، عبداللہ بن زید انصاری، عبداللہ بن ابی بکر تیمی، محمد بن مسلمہ اوسی، زبیر بن عوام اسدی، قضاعی بن عمرو، ابان اموی، یزید بن ابی سفیان اموی، ابوسفیان بن حرب اموی، عامر بن فہیرہ تیمی، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، عبداللہ بن رواحہ خزرجی، خالد بن ولید مخزومی، حاطب و حویطب (فرزندان عمرو) عامری، حذیفہ بن یمان غطفانی اوسی، حصین بن نمیر، ابوایوب انصاری، معیقب بن ابی فاطمہ دوسی، عمرو بن عاص سہمی، بریدہ بن حصیب اسلمی، ابوسلمہ مخزومی، عبدربہ، عبداللہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول خزرجی کے اسماء گرامی مذکورہ بالا کاتبین وحی کے علاوہ بتائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی اس امکان سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے علاوہ متعدد دوسرے صحابۂ کرام بھی اس طبقۂ عمال میں شامل تھے۔[۶۹]

مخصوص معاملات کے کاتبوں میں حضرات حصین بن نمیر اور مغیرہ بن شعبہ شامل تھے جو خفیہ امور تحریر کرتے تھے[۷۰]۔ جبکہ حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات و محاصل کے کاتب تھے[۷۱]۔ حضرت حذیفہ بن یمان آراضی کی پیداوار کے[۷۲] اور حضرت شرحبیل بن حسنہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے نام فرامین رسالت کے کاتب تھے[۷۳]۔ حضرت معاویہ اموی کا بعض مواقع پر خاص طور سے انتظار کیا گیا تھا[۷۴]۔ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسیؓ نہ صرف کاتب نبوی تھے بلکہ صاحب خاتم نبوی بھی تھے۔ ایک روایت کے مطابق یہی خدمت حضرت حنظلہ بن ربیع اسدیؓ بھی انجام دیتے تھے[۷۵]۔ لیکن سب سے بڑے اور صحیح معنوں میں آپ کے سکریٹری حضرت بلال حبشیؓ تھے جو آپ کے خانگی امور کے نگراں، قرض و ادھار کے منتظم، میزبانی کے مہتمم، اذن و اجازت دلوانے والے، سترہ بردار، وضو کے پانی کا انتظام کرنے والے، انعام کی رقم عطا کرنے والے، خازن و خزانچی، منادی و معلن، سفیر اور متعدد دوسرے فرائض و امور کے نگراں تھے۔[۷۶]

ان کاتبوں کا تعلق سابقین، متوسطین اور متاخرین اسلام تینوں طبقات سے

تھا۔ ستر ؔ کے لگ بھگ سابقینِ اولین میں سے تھے جبکہ بقیہ میں سے اکثر متاخرین میں شامل تھے۔ اکثر و بیشتر جوان طبقہ کے تھے۔ تقریباً اکتیس[۳۱] حضرات کا تعلق وسطی قبائلِ قریش و انصار سے تھا جبکہ بقیہ میں سے اکثر ان کے حلیفوں میں شامل تھے۔ ایک دُو کے سوا جن کا تعلق مشرقی و مغربی قبائلِ ثقیف و اسلم سے تھا، سب کے سب مکہ کے مہاجر یا مدینہ کے انصار اور باشندے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کی تقرری ان کے کاتب ہونے کی صلاحیت کے علاوہ ان کی دیانت و امانت اور اعلیٰ کردار کے سبب ہوئی تھی۔ اگر وہ ایمان و عمل کی کسوٹی پر کھرے نہ اترے ہوتے تو ہرگز اس مہتم بالشان کام کے مستحق نہ ٹھہرتے۔[۶۶]

سفیرانِ نبوی

سفیرانِ نبوی کا طبقۂ حکام نبوی حکمتِ عملی اور انتظامیہ کا ایک اہم حصہ تھا۔ ان کے ضروری اوصاف حکمت و فراست، دیانت و امانت، طلاقت و فصاحت اور شخصیت و جاذبیت تھے۔ موقع و محل کی موزونیت بھی ایک اضافی صفت تھی۔ دورِ جدید کے ایک عرب عالم کتّانی نے نبوی سفیروں کو ان کے کاموں اور فرائض کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ کچھ سفیر تبلیغِ اسلام کے لیے بھیجے گئے تھے تو کچھ دوسرے صلح کے معاہدے کرنے کے لیے۔ بعض نے لوگوں کو امان دی تھی تو بعض دوسروں نے غیر ممالک سے مسلم طبقات کی واپسی کا انتظام کیا تھا۔ بعض نے تحائف پہونچائے تھے تو بعض دوسروں نے کافروں کو ان کے کفر کے برے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔[۶۷] ظاہر ہے کہ یہ تقسیم و تعین کار نہ تو مکمل و جامع ہے اور نہ اس سے پوری تفصیل ہی سامنے آتی ہے۔ بہرحال اس سے سفیروں کی خدمت کی نوعیت کا کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اسلامی سفیروں کی پہلی تقرری عسکری یا نیم عسکری مہموں کے زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب کی تقرری کا ذکر غزوۂ بدر کے ضمن میں ملتا ہے جب کہ انھوں نے قریش کو جنگ سے باز رہنے کی دعوت دی۔[۶۸] حضرت محمد بن مسلمہ اوسی کو بنو قینقاع اور ان کے بعد بنو نضیر کے یہود کو

فیصلۂ نبوی سے آگاہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔[۸۵] اسی طرح بنو قریظہ کو جنگِ احزاب کے دوران سازش سے روکنے اور معاہدۂ صلح و اتحاد یاد دلانے کی غرض سے حضرات سعد بن معاذ اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی کو بعض دوسرے صحابہ کے ساتھ بھیجا گیا۔[۸۶] صلحِ حدیبیہ کے دوران قریشِ مکہ سے صلح کی گفت و شنید کے لیے کم از کم تین[۳] سفیروں۔ حضرات خراش بن امیہ خزاعی، عثمان بن عفان اموی اور علی بن ابی طالب ہاشمی۔ کی تقرری عمل میں آئی۔[۸۷]

دوسرے عرب قبائل اور شیوخ کے پاس جو نبوی سفارتیں روانہ کی گئیں ان کی تعداد خاصی ہے۔ حضرت سلیط بن عمرو عامری کو شاہانِ یمامہ کے پاس دعوتِ اسلام دے کر بھیجا گیا۔ اسی زمانے میں حضرات علاء بن حضرمی، عمرو بن عاص سہمی اور مہاجر بن ابی امیہ مخزومی کو بالترتیب بحرین، عمان اور حمیر (یمن) کے بادشاہوں کے دربار میں روانہ کیا گیا۔ متعدد دوسرے سفیروں میں حضرات نمیر بن خرشہ ثقفی، ظبیان بن مرثد سدوسی، عیاش بن ابی ربیعہ مخزومی، دحیہ بن خلیفہ کلبی اور علقمہ و عمرو فرزندان فغواء خزاعی کو بالترتیب قبائلِ طائف، بکر بن وائل، حمیر، اسقفِ نجران اور ابوسفیان بن حرب اموی کے پاس روانہ کیا گیا۔ پہلی چار سفارتیں کلی طور سے مذہبی اور سیاسی تھیں جبکہ آخری دو سفارتیں قریش کے حاجت مندوں کے لیے مالی امداد لے کر گئی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کی بھی ایک اور سفارت بھیجے جانے کا ذکر ملتا ہے۔[۸۸]

حیاتِ نبوی کے آخری زمانے میں بعض سفارتیں مختلف قبائلِ عرب کے پاس بھیجی گئی تھیں۔ چنانچہ اس ضمن میں حضرات وبر بن عمیس خزاعی (ابناءِ یمن اور ان کے شیوخ کے پاس)، فرات بن حیان عجلی (بنو حنیفہ کے ایک مسلم سردار حضرت ثمامہ بن اثال کے لیے) اقرع بن حابس حمیری (شاہانِ زود اور مران کے دربار میں)، صلصل بن شرحبیل (قبیلۂ بنی عامر کے علاقہ میں) ضرار بن الازور اسدی (ان کے اپنے قبیلہ کے بطون بنو صیدا اور بنو دیل کے پاس) اور زیاد بن حنظلہ تمیمی اور نعیم بن مسعود اشجعی /غطفانی کو ان کے اپنے قبیلوں کے درمیان بھیجے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح یمامہ کے جھوٹے مدعیٔ نبوت مسیلمہ کذاب کے پاس کم از کم تین سفارتیں بھیجنے کا حوالہ آیا ہے، جو بالترتیب حضرات عمرو بن امیہ ضمری، حبیب بن زید خزرجی اور عبداللہ بن وہب اسلمی کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھیں۔

کتانی کے بقول حضرات عمیر بن وہب جمحی اور ام حکیم بنتِ ہشام مخزومی نے بطور سفیرانِ نبوی صفوان بن امیہ جمحی اور عکرمہ بن ابوجہل مخزومی کو امان کا پیغام پہونچایا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد سفارتیں عرب قبائل اور ان کے شیوخ کی خدمت میں بھیجی گئی تھیں جن کے سفیروں کے نام مصادر میں نہیں مذکور ہوئے۔ البتہ بعض ناموں کا ذکر اسد الغابہ میں ضرور ملتا ہے۔[۵۸]

مشہور روایت ہے کہ صلحِ حدیبیہ کے معًا بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض پڑوسی سلاطین اور ان کے عرب باجگذاروں کے پاس کئی سفارتیں تبلیغِ اسلام اور سیاسی مفاہمت کے لیے روانہ کی تھیں۔ یہ سفیر حضرات دحیہ بن خلیفہ کلبی، عبداللہ بن حذافہ سہمی، عمرو بن امیہ ضمری، حاطب بن ابی بلتعہ لخمی، شجاع بن وہب اسدی اور حارث بن عمیر ازدی تھے جو بالترتیب رومی شہنشاہ ہرقل، ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز، نجاشیٔ حبشہ اصحمہ، مقوقس مصر، شاہِ تخوم شام اور حارث بن عمیر غسانی شاہِ بصریٰ کے درباروں میں اسلام کا پیغام لے کر گئے تھے۔[۵۹]

کل سفیرانِ نبوی جن کے نام کتبِ تاریخ وسیر میں اب تک مل سکے ہیں انتالیس[۴۹] ہیں جبکہ ان کی کل تقرریوں کی کل تعداد تینتالیس[۴۳] ہے۔ یعنی بعض حضرات نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ خدمت انجام دی تھی۔ مرکزی عرب کے قبائل میں قریش کے آٹھ[۸] افراد نے آٹھ[۸] مواقع پر سفارت کا عہدہ سنبھالا تھا۔ ان کے بطون میں بنو مخزوم اور بنو سہم کے دو دو[۲] افراد شامل تھے جبکہ بنو ہاشم، بنو امیہ، اور بنو عامر بن لوی کا صرف ایک ایک فرد۔ دلچسپ بات ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں عہدۂ سفارت رکھنے والے بطن بنو عدی (خاندانِ عمر بن خطاب) کا صرف ایک نمائندہ شریک تھا۔

بقیہ مرکزی قبائل میں خزرج کے دو[۲] افراد نے تین[۳] بار اور اوس کے دو[۲] افراد نے اتنی ہی بار سفارت کا فرض انجام دیا تھا۔

شمالی عرب کے قبیلے کلب کے تین[۳] افراد نے دو[۲] بار اور لخم کے ایک سفیر نے ایک بار پیغامِ نبوی پہونچایا تھا۔

مشرقی قبائل میں ہوازن، خزیمہ اور غطفان کے بالترتیب تین[۳]، دو[۲] اور ایک سفیر تھے۔

مغربی قبائل میں خزاعہ کے سات سفراء نے باری باری سے یہ خدمت انجام دی تھی۔ کنانہ کے ایک سفیر نے تین مواقع پر اور ازدشنوءہ کے ایک سفیر نے ایک بار عہدۂ سفارت سنبھالا تھا۔

جنوبی قبائل میں بجیلہ، سدوس، حضرموت اور حمیر کے بالترتیب دو دو اور ایک ایک سفیر تھے۔ منتشر قبائل میں صرف تمیم کے ایک سفیر کو نمائندگی ملی تھی جبکہ بقیہ دو کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔

جہاں تک ان سفیروں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق ہے تو ان میں سے صرف ایک چوتھائی کا تعلق سابقینِ اوّلین کے طبقہ سے تھا اور اس سے کچھ کم کا متوسطین کے طبقہ سے اور بقیہ کا متاخرین کے طبقہ سے تھا۔ عمر کے اعتبار سے غالب ترین اکثریت جوانوں کی تھی۔ اسلام میں عہدۂ سفارت عارضی تھا اور سفیروں کو غالباً زادِ راہ کے سوا اور کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔[۸۶]

مخصوص افسرانِ نبوی

کچھ انتظامی امور کو انجام دینے اور بعض احکامِ شریعت کو نافذ و جاری کرنے کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مخصوص افسروں کو بھی مقرر فرمایا تھا۔ یہ خدمت بھی عارضی نوعیت کی تھی اور سراسر رضاکارانہ۔ اس ضمن میں سب سے مشہور واقعہ حضرت سعد بن معاذ اوسی کے بنو قریظہ کے معاملہ میں حَکَم بنائے جانے کا ہے۔[۸۷] اس تحکیم کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ انھوں نے تمام بالغ یہودی مردوں کے قتلِ عام کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن بعض جدید تحقیقات نے اس پر شبہ کا اظہار کیا ہے۔[۸۸] اس طبقۂ عمال میں سب سے اہم حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی تھے جنھوں نے تین مواقع پر تقرری کی سعادت پائی۔ دو بار بنو جذیمہ اور بنو جذام کے مقتولوں کی دیت یا خون بہا ادا کرنے اور ان کے قیدیوں کو واپس کرنے کے لیے مقرر ہوئے تھے اور ایک بار فتح مکہ کے دوران بعض پرجوش مسلمانوں کی غلطی سے ہونے والی خوں ریزی کا معاوضہ ادا کیا تھا۔[۸۹]

غزوۂ تبوک کے زمانے میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی نے غزوہ سے قبل منافقین کے ایک سازشی مرکز کو منہدم کیا تھا تو غزوہ کے بعد حضرات مالک بن دخشم اوسی اور معن بن عدی اوسی نے ان کی "مسجد ضرار" کو مسمار کیا تھا۔[۹۲] حضرت انیس بن ضحاک سلمی نے اپنے قبیلہ کی ایک عورت پر زنا کی حد جاری کی تھی۔ جبکہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک عیسائی کی آدھی دولت بطور جرمانہ ضبط کی تھی۔ دو بھائیوں کے درمیان ایک جائداد کے معاملے پر جھگڑے کو سلجھانے کے لیے حضرت حنظلہ بن یمان کو مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت ابو امامہ باہلی نے خون کھانے کی حرمت کے قانون کا نفاذ کیا تھا۔ جبکہ حضرت علیؓ نے مکہ میں اس حکم الٰہی کا اعلان کیا تھا کہ فتح کے چار ماہ بعد مکہ میں کافروں کا داخلہ ممنوع ہوگا۔ خیبر کے زمانے میں بعض ماکولات و مشروبات اور لین دین کے معاملات کے حرام ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اسی طرح اس زمرہ میں حضرات علاء بن عقبہ اور ارقم بھی شامل نظر آتے ہیں اگرچہ ان کے فرائض کی نوعیت واضح نہیں ہے۔[۹۳]

بہرکیف بارہ معلوم افسرانِ خصوصی میں سے تین کا تعلق قریش کے بطون ہاشم، تیم اور عدی سے تھا جبکہ خزرج کا کوئی فرد شریک نہیں تھا البتہ اوس کے چار حضرات کو یہ شرف نصیب ہوا تھا۔ بقیہ قبائل میں ازد، اسلم اور غطفان کے افراد تھے اور دو کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ قریشی افسرانِ سابقین اولین میں سے تھے جبکہ بقیہ کا تعلق مدنی عہد سے ہے۔ البتہ بہ اعتبار عمر سب کا تعلق جوانوں کے طبقہ سے تھا۔[۹۴]

شعراء و خطباء

قرونِ وسطیٰ کے عرب میں شعر و خطابت کو ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا کہ وہ ابلاغ و ترسیل کے دو طاقتور اور موثر ترین ذرائع تھے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سبب سے شعراء و خطباء کی صلاحیتوں کو اسلام اور ریاست کے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا تھا۔ خطابت تو خود جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ذاتی صفت تھی تاہم ایک موقع پر آپ نے حضرت ثابت بن قیس بن شماس خزرجی سے بھی یہ خدمت لی تھی۔ آپ کے مستقل شعراء حضرات حسان بن ثابت خزرجی، کعب بن مالک خزرجی اور عبد اللہ بن رواحہ

خزرجی تھے۔ یہ تینوں مدنی مسلم اور صاحب طرز شاعر تھے اور ان میں حضرت حسان کافی معمر تھے ایک اسلمی صحابی حضرت عامر بن سنان کا بھی ذکر شعراءِ دربارِ رسالت میں ملتا ہے۔[۹۵] ممکن ہے کہ اس خدمت کے لیے اور بھی صحابہ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا گیا ہو۔

حاجب اور آذن

بعض ایسے کارکنوں کا ذکر ملتا ہے جن کا کام ذاتِ رسالت کے دولت کدہ کی دربانی تھی۔ یہ خدمت حضرات عویم بن ساعدہ اوسی، رباح اسود حبشی، عنبسہ، ابوموسیٰ اشعری اور انس بن مالک خزرجی نے ایک آدھ بار انجام دی تھی جبکہ آپ کے مستقل دربان حاجب اور آذن (اجازتِ نبوی حاصل کرنے والے) حضرت عبداللہ بن زمعہ اسدی قریشی تھے جو اواخر مدنی عہد میں مسلمان ہو کر مدینہ آ گئے تھے اور مستقل دربانی کا فرض مسلسل انجام دیتے تھے حضرات رباح اور عنبسہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی تھے اور مکی عہد کے مسلمان، جبکہ حضرت عویم ابتدائی مدنی عہد کے مسلم تھے اور بقیہ اواخر مدنی عہد کے۔ تاہم ان سب کا تعلق جوانوں کے طبقہ سے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دربانی رضا کارانہ تھی اور وہ ذاتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان حجاب نہ تھی بلکہ عوامی رابطہ اور پل کا کام انجام دیتی تھی۔[۹۶]

صوبائی انتظامیہ گورنر/امیر

صوبائی انتظامیہ میں سب سے اہم، فعال اور صاحبِ اقتدار طبقہ والیوں (گورنروں) کا تھا جو اپنی ولایات (صوبوں) میں مکمل خودمختاری اور تمام فوجی، مالی، انتظامی اور مذہبی اختیارات رکھتے تھے اور اگر کوئی قدغن ان کے اختیار پر تھی تو وہ کتابِ الٰہی اور فرامینِ نبوی کی تھی کہ اس سے کسی مسلم حاکم کو مفر نہ تھا۔[۹۷]

صوبائی منتظمین کا تقرر مدینۂ منورہ سے کافی مسافت پر واقع علاقوں کی فتح کے بعد عمل میں آیا تھا اور ان میں سب سے پہلے خیبر، تیماء، وادی القریٰ اور قریٰ عربیہ کے علاقے تھے جن کے بالترتیب گورنر (والی) حضرات سواد بن غزیہ خزرجی، عمرو بن سعید اموی، یزید بن ابی سفیان

اموی اور عبداللہ (حکم) بن سعید اموی تھے[98] ان کا تقرر غالباً ۸ھ / ۶۲۹ء ہی میں ہوگیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد شہر الٰہی کے پہلے گورنر حضرت ہبیرہ بن شبل ثقفی تھے جن کی تقرری عارضی ثابت ہوئی اور جلد ہی ان کی جگہ حضرت عتاب بن اسید اموی نے لے لی جو بقیہ عہد نبوی اور ایک روایت کے مطابق پورے خلافت صدیقی میں اس عہدۂ جلیل پر فائز رہے[99]۔

وسطی عرب خاص کر مکہ مکرمہ کے قرب وجوار کے علاقے میں طائف، دبا اور جدہ کی ولایات کا واضح ذکر ملتا ہے جن کے گورنر بالترتیب حضرات عثمان بن ابی العاص ثقفی، حذیفہ بن یمان ازدی اور حارث بن نوفل ہاشمی تھے[100]۔

مشرقی ولایات میں حضرات عمرو بن عاص سہمی مرکزی گورنر تھے جبکہ حضرات جیفر اور عبد فرزندانِ جلندی جو سابق فرماں روایانِ علاقہ تھے صوبائی گورنر یا منتظم تھے۔ بحرین کے سابق فرماں روا حضرت منذر بن ساوی تمیمی اپنے علاقے میں حضرات علا بن حضرمی اور ابان بن سعید اموی کے زیر نگرانی انتظامی امور انجام دیتے تھے۔ مآخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحرین و عمان کی ولایات دو دو علیحدہ انتظامی علاقوں میں منقسم تھیں جن کے لیے مرکزی نمائندے اور منتظم الگ الگ مقرر کیے جاتے تھے[101]۔ مشرقی سواحل اور وسطی عرب کے درمیان آباد قبیلہ طے میں حضرت عدی بن حاتم طائی حکمراں تھے مگران کی حیثیت گورنر سے زیادہ مقامی منتظم کی معلوم ہوتی ہے[102]۔

شمالی علاقہ میں جو حدود شام کے قریب تھا حضرت شرحبیل بن حسنہ کندی کا مرتبہ و منصب گورنر جنرل کا تھا کہ ان کا صدر مقام ایلہ تھا اور وہ متعدد دوسرے ماتحت مرکزی منتظمین بھی رکھتے تھے جو مختلف علاقوں میں تعینات تھے[103]۔ لیکن علاقہ کی وسعت، اختیارات کی ہمہ گیری اور شہرت عام کے اعتبار سے سب سے اہم گورنر حضرت معاذ بن جبل خزرجی تھے جو پورے جنوبی عرب کے گورنر جنرل تھے اور یمن و حضرموت کے تمام مرکزی منتظمین اور والی ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے[104]۔ ان ماتحت گورنروں میں حضرات یعلیٰ بن امیہ تمیمی (الجند)، خالد بن سعید اموی (صنعاء)، طاہر بن ابی ہالہ تمیمی (عک و اشعر)، عکاشہ بن ثور غوثی (سکاسک و سکون)، ابوعبیدہ بن جراح فہری (نجران)، عمرو بن حزم خزرجی (نجران)، ابوسفیان بن حرب اموی (جرش)، سعید بن قشیب ازدی (جرش)، ابوموسیٰ اشعری (زبید، رمع، عدن اور ساحل)، زیاد بن لبید خزرجی (حضرموت)

عامر بن شہر ہمدانی (ہمدان) اور مہاجر بن ابی امیہ مخزومی (کندہ) کے اسماءِ گرامی شامل ہیں۔[۵۰]

حضرت معاذ اور ان کے ماتحت گورنروں کا تقرر حضرت باذان اور ان کے فرزندِ رشید حضرت شہر بن باذان ایرانی کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ ان دونوں ایرانی ابناء (فرزندوں) نے ۶۲۸ء سے ۶۳۲ء تک یمن اور دوسرے علاقوں پر بطور اسلامی گورنر حکومت کی تھی۔ دراصل باذان ایرانی شہنشاہ کے گورنر تھے اور انھوں نے خسرو پرویز کے قتل کے بعد اسلامی ریاست سے وفاداری استوار کر لی تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان کو پورے یمن کا گورنر برقرار رکھا۔ ان کی موت کے بعد ان کے فرزند شہر نے صوبائی حکومت سنبھالی مگر مرکز کو فوراً صوبہ کے سیاسی حالات کے اتار چڑھاؤ کی اطلاع دی جس کے بعد ہی مرکز سے حضرت معاذ بن جبل اور ان کے معاونین کو بھیجا گیا تھا۔ ان نئے مرکزی منتظمین کی آمد کے فوراً بعد ہی حضرت شہر بن باذان کی شہادت یمن کے ایک مدعیٔ نبوت اسود عنسی کے ہاتھوں ہوئی اور نئے گورنروں نے اپنی اپنی ولایت کے معاملات سنبھال لیے مگر جلد ہی ان کو ردّہ کے فتنہ کا سامنا ہوا۔ جس کی سرکوبی میں وہ پوری طرح کامیاب و کامران رہے۔[۵۱]

اختیارات و مدتِ تقرری

حکومتِ نبوی کے افسران میں والیوں یا گورنروں کا طبقہ اپنی انتظامی کارکردگی اور وسیع اختیارات کے سبب اہم ترین تھا۔ شہری نظم و نسق کے اس شعبہ کے تمام کارکنوں کا تقرر مستقل بنیادوں پر ہوتا تھا۔ چنانچہ والیوں کی غالب اکثریت عہدِ نبوی کے اواخر تک اپنے اپنے مناصب پر قائز رہی، بلکہ ان میں سے بعض تو خلافتِ صدیقی اور خلافتِ فاروقی تک بحال رہے۔ عہدِ نبوی میں ان کے عہدہ کی مدت تین ماہ سے تین چار سال تک نظر آتی ہے۔

بعض گورنروں کو معزول یا تبدیل بھی کیا گیا۔ ان میں سے مکہ، نجران اور جرش کے پہلے گورنروں کی تقرری عارضی یا مختصر مدت کے لیے تھی جبکہ ان کے جانشینوں کی تقرری مستقل تھی۔ بحرین کے گورنر حضرت علاء بن حضرمی کے بارے میں روایات کا اختلاف ہے۔ بعض سے

ان کی معزولی کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی جگہ حضرت ابان بن سعید اموی کی تقرری کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن صحیح وہ روایت معلوم ہوتی ہے جس کے مطابق دونوں حضرات بحرین کے دو الگ الگ علاقوں کے حکمراں تھے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان گورنروں کو ان کی خدمات کے صلہ میں تنخواہیں بھی ملتی تھیں۔

ولاۃ نبوی کا قبائلی اور علاقائی تجزیہ خاصی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزل و نصب کی پالیسی کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔ کل والیوں کی تعداد تیئیس تھی جن میں سے قریش کے بارہ افراد تھے۔

قریشی ولاۃ میں سب سے زیادہ یعنی سات کا تعلق بنو امیہ کے مختلف خانوادوں سے تھا۔ ان میں سے چار جو حقیقی بھائی بھی تھے مشہور سعیدی خانوادہ (بنو ابی احیحہ سعید بن عاص) سے تعلق رکھتے تھے، دو کا تعلق بنو حرب بن امیہ کے خاندان سے تھا جبکہ آخری اموی والی حضرت عتاب بن اسید کا تعلق اس کی ایک نسبتاً کم اہم شاخ بنو اسید سے تھا۔ حضرت ابوسفیان کے سوا جو جلد ہی سبک دوش ہو گئے تھے بقیہ اپنی ولایات میں پوری مدت تک کام کرتے رہے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن سعید اموی، گورنر قرئ عربیہ جنگ موتہ میں شہید ہوئے تھے۔

بلاذری نے ایک روایت میں صراحت کی ہے کہ وفات نبوی کے وقت چار اموی گورنر اپنے عہدوں پر فائز تھے لیکن مورخ نے حضرت یزید بن ابی سفیان کا نام نہیں لیا ہے ورنہ ان کی تعداد پانچ ہوتی۔

ان "خالص امویوں" کے علاوہ دو اور گورنر — حضرات علاء بن حضرمی اور سعید بن قشیب ازدی بنو امیہ کے حلیف تھے اس لیے عرب قبائلی روایات کے مطابق ان کا شمار بھی ان کے سرپرست خاندان ہی میں کیا جاتا ہے۔

باقی قریشی گورنروں میں بنو ہاشم، بنو فہر، بنو مطلب، بنو سہم اور بنو مخزوم کے صرف ایک ایک فرد شامل تھے۔ مدینہ کے قبیلۂ خزرج کے چھ گورنر تھے جن کا تعلق اس کی مختلف شاخوں سے تھا۔ اس طرح وسطی و مرکزی قبائل کی نمائندگی اس شعبۂ حکومت میں لگ بھگ

چھپن فیصد تھی ۔ یہ دل چسپ اور اہم نکتہ ہے کہ مدینہ منورہ کے ایک دوسرے قبیلہ اوس کو اس طبقہ میں کوئی نمائندگی نہیں ملی ۔

مشرقی عرب کے قبائل میں سے صرف ثقیف اور طے کو نمائندگی ملی تھی ۔ ان میں سے اول الذکر کے اگرچہ دو گورنر تھے لیکن ایک کی تقرری عارضی ثابت ہوئی ۔ شمالی عرب کے کسی فرد کو یہ عہدہ نہیں ملا البتہ جنوبی عرب کے چھ طبقات / قبائل کے نو افراد اس عہدہ پر فائز ہوئے تھے ۔ ان میں سے دو ایرانی تھے ۔ پراگندہ اور منتشر قبائل میں سے صرف تمیم کے دو گورنروں کا ذکر ملتا ہے ۔[۱۰۹]

جہاں تک ان گورنروں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا تعلق ہے تو تینتیس[۳۳] افراد میں سے صرف پانچ کو سابقین اولین کے زمرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے ، جبکہ آٹھ دوسرے ہجرت سے کچھ قبل یا کچھ بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے اور بقیہ نے کافی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا ۔ ان میں سے سات صلحِ حدیبیہ سے کچھ پہلے یا اس کے معًا بعد زمانے کے مسلمان تھے باقی فتحِ مکہ کے زمانے کے مسلمان اور طلقاءِ مکہ میں سے تھے ۔ ان میں حضرت عتاب بن اسید اموی کی نفرت اسلام کا ذکر روایات میں عین فتحِ مکہ کے زمانے میں بھی لایا جاتا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے ۔ اسی طرح حضرات ابوسفیان بن حرب اموی اور نوفل بن حارث ہاشمی مدتوں تک بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی تقرری سے چند ماہ قبل تک اسلام دشمن طبقہ کے سربراہ رہے تھے ۔ ثقیف کے دونوں افراد ـــ حضرات ہبیرہ اور عثمان ـــ بھی فتحِ مکہ سے ذرا قبل اور بعد کے مسلم تھے ۔

اس تجزیہ سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ اسلام سے پہلے کے گناہ و جرائم پر نہ کوئی مواخذہ تھا اور نہ ہی یہ "سیاہ پس منظر" اسلامی ریاست کے مناصب پر تقرری کے باب میں کسی طور سے اثر انداز ہوتا تھا ۔

ایک دو گورنروں کے سوانح میں حضرت ابوسفیان اموی معمر ترین تھے بقیہ تمام گورنروں کا تعلق جوان نسل سے تھا ۔ ان میں سے حضرات عتاب بن اسید اموی اور عثمان بن ابی العاص ثقفی کے بارے میں مآخذ میں صراحت ملتی ہے کہ تقرری کے وقت ان کی عمر صرف

اٹھارہ[۱۸] بیس[۲۰] سال تھی۔ اسی طرح دوسرے بعض اہم ترین والیوں کی عمریں تیس[۳۰] چالیس[۴۰] کے درمیان تھیں یا اس سے بھی کم۔ اس حقیقت کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ ان نوجوانوں کو معمر اور اکابر صحابہ اور سن رسیدہ شیوخ و رؤسا، پر ترجیح دی گئی تھی۔[۱۱۱]

مقامی انتظامیہ

مرکزی اور صوبائی انتظامیہ کے جائزہ کے بعد مقامی انتظامیہ کا درجہ آتا ہے جو دراصل عرب کی قبائلی سرداری کے اصولوں پر قائم تھا۔ عملاً مقامی انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہر رئیس و شیخ قبیلہ کی ہوتی تھی جو مختلف ماتحت بطون اور خاندانوں کے شیوخ کے ساتھ مل کر علاقہ و قبیلہ کا نظم و نسق چلاتا تھا۔ قبائلی شیوخ کا تقرر بنیادی طور سے ان کا اپنا داخلی معاملہ تھا لیکن اس کی منظوری اور تصدیق دربارِ رسالت سے بھی ضروری تھی۔ کبھی کبھی آپ ازخود کسی قبیلہ یا بطن یا گروہ کا سردار مقرر کر دیتے تھے اور اس پر کسی نے دخل اندازی کا الزام نہیں لگایا یا اور کسی طرح کی نکیر نہیں۔

مقامی منتظمین اور شیوخِ قبیلہ "ریگ کے ذرات یا آسمان کے ستاروں" کے مانند بے شمار تھے۔ ان میں سابقین بھی تھے اور متوسطین و متاخرین بھی ـــ جوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر اور بوڑھے بھی۔ یعنی ہر طبقہ و عمر کے افراد ان میں شامل تھے۔ جنھوں نے مختلف اوقات میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں سے اکثر کا ذکر ماخذ میں نہیں ملتا، محض گنتی کے چند ناموں کا حوالہ صراحت کے ساتھ ملتا ہے جن پر تفصیل سے کہیں اور بحث کی جا چکی ہے۔

انھیں مقامی منتظمین میں شہرِ مدینہ کے نقیبوں کا شمار بھی ہونا چاہیے کہ ان کی انتظامی ذمہ داری بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ ان کی تعداد شروع میں بارہ[۱۲] تھی جن میں سے نو[۹] خزرج اور تین[۳] اوس کے تھے۔ بعد میں بعض کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں کو مقرر کیا گیا۔ ماخذ سے ان کی کل تعداد اٹھارہ[۱۸] معلوم ہو سکی ہے۔ ان میں سے خزرج کے بارہ[۱۲] افراد تھے جن کے اسماءِ گرامی ہیں۔ حضرات اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبداللہ بن رواحہ، رافع بن مالک، براء بن معرور، بشر بن براء بن معرور، عبداللہ بن عمرو، سعد بن عبادہ، منذر بن عمرو، عبادہ بن صامت،

عمرو بن جموح اور مسیب بن عمرو۔ ان میں حضرت بشر اور آخری دو حضرات بعد میں کسی وقت مقرر ہوئے تھے۔ اوس کے نقیب تھے: حضرات اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ، رفاعہ بن عبدالمنذر، ابوالہیثم بن التیہان اور رافع بن خدیج۔ ان میں سے موخرالذکر دو کا تقرر بعد کے زمانے کا ہے۔ حضرت اسعد بن زرارہ خزرجی نقیب النقباء تھے مگر ہجرت کے معاً بعد ہی ان کی وفات ہوگئی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عہدۂ جلیلہ بنفس نفیس سنبھال لیا۔[۱۲]

قضا و قضاۃ

قرونِ وسطیٰ میں قضا یا قاضی کا عہدہ انتظامیہ کا ہی جزو سمجھا جاتا تھا چنانچہ اکثر و بیشتر حاکم علاقہ عدلیہ کا افسرِ اعلیٰ بھی ہوتا تھا۔ اس حیثیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ریاستِ اسلامی کے قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس بھی تھے۔ مرکز میں آپ کے علاوہ حضرات عمر، علی، معاذ بن جبل، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عقبہ اور معقل بن یسار کے اسماءِ گرامی قاضیان و مفتیانِ شہر میں گنائے جاتے ہیں۔

صوبائی گورنروں خاص کر حضرت معاذ بن جبل خزرجی کے بارے میں بڑی صراحت کے ساتھ یہ بیان ملتا ہے کہ ان کو قاضی کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ مقامی طور سے یہ اختیارات مقامی منتظمین کو بھی عطا کیے گئے تھے۔ ان قضاۃ کے بارے میں یہ اہم بات ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ ان کے دوسرے اختیارات کی مانند ان کے عدلیہ کے اختیارات بھی انھیں کے علاقوں تک محدود تھے اور کسی دوسرے علاقہ کے قاضی کے فیصلے پر اثرانداز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس قسم کا اعلیٰ حق صرف نبوی عدلیہ کو حاصل تھا جو تمام عدالتوں پر تفوق و امتیاز رکھتی تھی۔[۱۳]

دوسرے عمال

مقامی منتظمین میں بازار کے افسروں کا ذکر بھی ملتا ہے جو خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ شہرِ مدینہ اور دوسرے بازاروں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار و اقتدار بطور سربراہِ مملکت کے قائم تھا تاہم آپ نے شہرِ مدینہ کے لیے ایک مخصوص افسرِ بازار کا تقرر کیا تھا اور وہ حضرت عمر

فاروق تھے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق فتح مکہ کے فوراً بعد بنو امیہ کے خاندانِ سعیدی کے ایک فرد حضرت سعید بن سعید اموی کو مکہ کے بازار کا افسر مقرر کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ طائف کے محاصرہ کے دوران شہید ہو گئے تھے تاہم ان کی تقرری سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ ان کے بعد ان کا جانشین یقیناً مقرر کیا گیا ہو گا۔ اس شعبہ میں ایک افسر اگر سابقینِ اولین میں سے تھا تو دوسرا متاخر مسلمانوں میں سے۔ عمر کے اعتبار سے دونوں کا شمار جوانوں میں کرنا چاہیے حضرت عمر کی مثال سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ افسر مستقل ہوتے تھے اور ان کو اس خدمت کا غالباً کچھ صلہ اور معاوضہ بھی ملتا تھا۔[۱۱]

اوصافِ تقرری

حکومتِ نبوی کے شہری نظم و نسق کے شعبہ میں افسروں اور حکام کی تقرری کی سب سے پہلی شرط و صفت اسلام پر پختہ عقیدہ تھا کہ اس کے بغیر تقرری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے بعد دوسری اہم ترین شرط صلاحیت و لیاقت تھی اور یہ اتنی اہم اور ہمہ گیر شرط تھی کہ اس کے سامنے سبقتِ اسلام[۱۱] اور خدماتِ دینی بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ سبقتِ اسلام یا دینی معلومات بذاتِ خود اہم ترین خصوصیات ہیں اور دین و مذہب کے باب میں ان سے بہتر اور کوئی صفت شائد نہ ٹھہرے لیکن انتظام و انصرام میں انتظامی لیاقت، سیاسی تدبر، دنیاوی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور حالات و مواقع کی واقفیت وغیرہ زیادہ اہم تھیں اور ان کی رعایت نبوی انتظامیہ میں ہمیشہ اور بھرپور کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ متاخر مسلمانوں اور نوجوان صحابہ کو اکابر صحابہ اور سابقینِ کرام پر اکثر و بیشتر ترجیح دی گئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دانستہ طور سے اور بڑی حکمت و تدبر کے ساتھ یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ اکابر صحابہ کو انتظامی مشنری میں پوری طرح مدغم نہ کیا جائے بلکہ ان کو بطور مشیر و وزیر پایۂ تخت میں رکھا جائے۔ اس کی دو مصلحتیں معلوم ہوتی ہیں: اول یہ کہ ان کی معاملہ فہمی، تدبر اور اصابتِ رائے سے فائدہ اٹھایا جائے اور دوم یہ کہ انتظام و انصرام کے لوث و غش سے ان کو پاک و صاف رکھا جائے تاکہ عوام میں وہ اپنے عہدوں اور مناصب

کے سبب "آلودۂ داماں" نہ گردانے جائیں اور ان کے ساتھ احترام، عقیدت اور محبت کے جذبات قائم رہیں۔ یہی سبب ہے کہ نبوی انتظامیہ میں نوجوان اور پرجوش صحابہ کو اکابر و قدیم صحابہ پر ہر شعبۂ انتظام میں ترجیح دی گئی۔

علاقائی اور قبائلی رعایت بھی وجہ تقرری بن سکتی تھی لیکن اس کی حیثیت ہمیشہ ثانوی ہی رہی جہاں تک سماجی قدر و منزلت اور خاندانی جاہ و عزت کا تعلق ہے تو نبوی انتظامیہ میں اور دوسرے شعبوں کی مانند اس کا قطعی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے رشتہ داری قرابت اور خاندانی تعلق نہ تو تقرری کی بنیاد بنتے تھے اور نہ تقرری میں مانع ہی تھے۔ گذشتہ صفحات کی مفصل بحث سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حکومتِ نبوی کی اساس صلاحیت و لیاقت کے اوصاف پر رکھی گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر شعبہ و محکمہ میں پوری طرح مثالی اور کامیاب ثابت ہوئی۔

فوجی تنظیم

مدینۂ منورہ کی اسلامی ریاست کی نظریاتی طاقت قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی کے عظیم سرچشموں سے ابھری تھی اور اخلاقی قوت اسلامی نظام کی حکمتِ بالغہ سے۔[۱۱۶] اس کے قیام و استحکام میں مادی طاقت کی ضرورت تھی۔[۱۱۷] جسے فوجی قوت کی شکل میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ پالیسی نے وجود بخشا۔ اس لیے اسلامی ریاست اور نبوی حکومت دونوں کے قیام، ارتقاء اور تکمیل میں کلیدی کردار آپ کی عسکری تنظیم اور فوجی محکمے نے ادا کیا تھا۔[۱۱۸] ایک اعتبار سے اسلامی ریاست کا وہ سب سے فعال اور موثر شعبہ تھا، اور اسلام کے سیاسی اداروں اور حکومتی محکموں میں اس کو اولیت کا شرف بھی بڑی حد تک حاصل تھا۔ کیونکہ ہجرتِ نبوی کے بعد مواخات اور دستورِ مدینہ کے نفاذ کے ساتھ ساتھ اولین مہمیں بھی ترتیب دی گئی تھیں[۱۱۹] جن کے ساتھ نبوی فوجی تنظیم کا آغاز ہوا۔

نبوی عسکری نظام میں جن افسروں اور کارکنوں کو مقرر کیا گیا تھا ان میں سرِ ایک کے امیر، جیشِ نبوی کے سالار، حرس کے افسر و کارکن، معسکر یا خیمہ گاہ کے سالار، عرض و معاینہ کے نگران و مہتمم، خیل یا شہسوار فوج کے کمانڈر، صوبائی فوج کے سپہ سالار، اسلامی افواج کے علم بردار، طلیعہ یا گشتی دستوں کے افسر و سپاہی، جاسوس و نگراں، راہبر و دلیل، اموالِ غنیمت کے افسر، اسلحہ و ہتھیار کے نگراں اور محافظِ جسم دستوں کے سالار شامل تھے۔[۱۲۰] مختلف فوجی افسروں اور سالاروں کی تقرری جن بنیادوں پر ہوتی تھی اور ان کے سلسلے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حکمتِ عملی اور پالیسی تھی وہ اس کے تاریخی ارتقاء کے تجزیہ سے واضح ہوتی ہے۔

مستقل سالارِ اعظم

اسلامی عسکری تنظیم میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام و مرتبہ کو سب سے

پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ نظریاتی اعتبار سے اب یہ ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ عہدِ نبوی کے نظامِ حکومت میں، خواہ اس کا تعلق فوجی محکمہ سے ہو، خواہ شہری انتظامیہ سے، تمام اختیار واقتدار کا حق ذاتِ نبوی کو حاصل تھا کہ آپ زمین پر اللہ تعالیٰ کے فرستادہ و پیغمبر ہونے کے ناطے خلیفۂ الٰہی تھے اور اللہ بزرگ و برتر کے احکام و ہدایات کے مطابق حکومت کرتے تھے۔ علمی اور تاریخی لحاظ سے آپ کے اختیار واقتدار کے حق کو پہلے بیعتِ عقبۂ اولیٰ (سنہ ۱۲ نبوی / ۶۲۱ء) اور بیعتِ عقبۂ ثانیہ (سنہ ۱۳ نبوی / ۶۲۲ء) میں صراحت کے ساتھ یا مضمر انداز میں تسلیم کیا گیا اور ہجرت کے بعد دستورِ مدینہ (سنہ ۱ھ / ۶۲۲ء) میں خاص کر اس کی تین دفعات ۲۳، ۳۶ء اور ۴۲ء میں واضح کیا گیا تھا۔[۱۲۱]

اس حقِ نبوی کو تمام باشندگانِ مدینہ نے، خواہ ان کا تعلق مسلم طبقاتِ انصار و مہاجرین سے ہو خواہ غیر مسلم طبقاتِ یہود و عرب سے، برضا و رغبت قبول کیا تھا۔ لہٰذا مونٹگمری واٹ کا یہ سوال و مباحثہ کہ آپ کو عسکری قیادت کا حق کس نے دیا تھا[۱۲۲] بے محل بھی ہے اور لا طائل بھی۔ تاریخی حقائق ثابت کرتے ہیں کہ روزِ اول سے آپ نے دوسرے ریاستی اختیارات کے مانند عسکری و فوجی قیادت کے اختیار کا بھرپور استعمال کیا تھا اور اہلِ مدینہ میں سے کسی کی جانب سے بھی اس کے خلاف کبھی نہ صدائے احتجاج اٹھی تھی اور نہ اس پر کوئی ہلکا سا اعتراض ہی ہوا تھا اس لیے کہ سب کو تسلیم تھا کہ آپ کو اختیارِ اعلیٰ حاصل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک دوسرا اہم نکتہ بھی یہاں ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام سیاسی اختیارات مستقل طور سے حاصل تھے اور ان میں عسکری قیادت کا حق بھی شامل تھا۔ گویا کہ صرف ذاتِ نبوی ہی اسلامی افواج کی سالارِ اعلیٰ تھی اور اسی کو دوسرے افسرانِ حکومت کی مانند سالارانِ لشکر کے عزل و نصب، تقرری و تبدیلی اور برخاستگی کا اختیار حاصل تھا۔

عارضی امرارِ فوج

ظاہر ہے کہ دوسرے امرائے لشکر جن کو آپ اپنے اختیارات کے تحت مقرر فرماتے تھے عارضی ہوتے تھے اور ان کی تقرری ایک خاص مدت کے لیے ہوتی تھی۔ نظریاتی طور سے

موجودہ سیاسی اصطلاح میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے اختیارِ قیادت کو عارضی طور سے اپنے نائب کی طرف منتقل کر دیتے تھے اور وہ اس بنا پر قائدِ لشکر بن جاتا تھا۔

ایک اور تاریخی سبب بھی سالارانِ لشکر کی تقرری کی عارضی نوعیت کا سبب بنا تھا اور وہ یہ تھا کہ اسلامی ریاست کی کوئی باقاعدہ مستقل فوج نہیں تھی۔ شہر واطرافِ شہر کی کل مسلم آبادی اسلامی فوج تھی یعنی ہر مسلمان کے لیے بوقتِ ضرورت وطلب فوجی خدمت لازمی تھی چنانچہ جب کبھی ضرورت پیش آتی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی فوج موقع ومحل کے تقاضے کے لحاظ سے طلب فرما لیتے اور مناسب سمجھتے تو خود اس کی کمان فرماتے اور ضرورت سمجھتے تو اپنے کسی صحابی کو یہ اختیارِ قیادت منتقل فرما دیتے۔

ایسے امیرِ لشکر کا اختیارِ قیادت یا پروانۂ تقرری صرف اسی مہم یا موقع کے لیے ہوتا اور جوں ہی مہم ختم ہوتی اس کی تقرری بھی ختم ہوجاتی اور قیادت کا اختیار پھر ذاتِ نبوی کو منتقل ہوجاتا کہ آپ ہی اصل سرچشمۂ اختیار تھے۔ اسلامی تاریخ میں آپ کی قیادت میں جانے والی مہموں کو غزوہ/غزوات اور صحابۂ کرام کے زیرِ کمان مہموں کو سریہ/سرایا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

امرائے لشکر کا تجزیہ

امرائے سرایا کی تقرری اور ان کے عہدہ کی یہی عارضی نوعیت تھی کہ دس برس کی مختصر مدت میں تقریباً چوہتر تقرریاں انچاس افراد کو بطور امیر سریہ حاصل ہوئیں[123]۔ تقرریاں اور قائدین کی تعداد کے درمیان اس واضح فرق سے یہ حقیقت از خود عیاں ہوجاتی ہے کہ بعض سالارانِ نبوی کو ایک سے زیادہ مرتبہ عسکری اور فوجی کمانداری کی سعادت ملی تھی۔ ایک تحلیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ افراد کو دو مرتبہ سالاری کا عہدہ ملا تھا۔ ان میں حضرات ابوعبیدہ بن جراح فہری[124]، ابوقتادہ خزرجی، عمرو بن عاص سہمی، عبداللہ بن رواحہ خزرجی، عکاشہ بن محصن اسدی/خزیمی اور بشیر بن سعد خزرجی شامل تھے[125]۔ تین بار قیادت کرنے والے سالار حضرات علی بن ابی طالب ہاشمی اور محمد بن مسلمہ اوسی تھے۔ چار چار سرایا کی کمان کرنے

والوں میں صرف دو حضرات خالد بن ولید مخزومی اور غالب بن عبداللہ لیثی تھے[۱۲۶] تعداد کے اعتبار سے سب سے اہم قائد سریہ حضرت زید بن حارثہ کلبی تھے جن کو یہ عہدۂ جلیلہ گیارہ یا تیرہ بار بہ اختلافِ روایت تفویض ہوا تھا۔ لیکن صراحت کے ساتھ ان کی تقرری کا بیان صرف نو سرایا میں ملتا ہے[۱۲۷] ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ نصف سے کچھ کم تقرریوں پر ان مذکورہ بالا قائدوں کا قبضہ رہا تھا اور صرف چونتیس سالاروں کو صرف ایک بار فوجی قیادت کا موقع اور عہدہ ملا تھا۔

عظیم ترین قائدِ نبوی

مذکورہ بالا تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام سالارانِ سرایا میں حضرت زید بن حارثہ کلبی کو سب سے زیادہ اعتمادِ نبوی حاصل تھا، اور ظاہر ہے کہ آپ کے اعتماد کا سبب حضرت زید بن حارثہ کی فوجی صلاحیت اور قائدانہ لیاقت تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تو ان کی کامیابی تھی جو انھوں نے اپنی تمام مہموں میں حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ دو روایتیں بھی ہیں جو ان کی تقرری کے عامل و سبب کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر کسی سریہ میں حضرت زید بن حارثہ شامل ہوتے تھے تو لازمی طور سے کمان انھیں کو سونپی جاتی تھی[۱۲۸]۔ دوسری روایت کا اگرچہ براہِ راست تعلق حضرت زید کی تقرری کی بجائے ان کے فرزندِ دلبند حضرت اسامہ کی تقرری سے ہے تاہم اس سے ان دونوں سالارانِ سرایا کی تقرری کے عامل پر روشنی پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کی تقرری پر وقتاً فوقتاً اشرافِ قریش کے ایک خاص طبقہ کی جانب سے ان کے موالی (آزاد کردہ غلام) ہونے کے نتیجہ میں ان کے سماجی فروتر مقام کے سبب اعتراض و نکتہ چینی دبے لہجہ میں ہوتی رہی تھی جو حضرت اسامہ کی تقرری کے وقت غالباً ان کی کم سنی و ناتجربہ کاری کے سبب کھل کر زبانوں پر آگئی تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات کی تکلیف کے باوجود اس نکتہ چینی اور اعتراض کا اپنے خطبۂ عالیہ میں جواب دیا اور ان دونوں سالاروں کی تقرری کو ان کی صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر حق بجانب قرار دیا[۱۲۹]۔ ظاہر ہے کہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں

اور فوجی لیاقتوں سے کسی بھی طبقہ کو انکار نہیں تھا۔ ان پر اعتراض ان کی سماجی فروتری کے سبب کیا گیا تھا جس کو اسلام اور پیغمبر اسلام نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور خاندانی شرف و بزرگی کو تقرری کی بنیاد نہیں گردانا۔

صلاحیت و لیاقت

طبقۂ اشراف کے اس اعتراض کو اس تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ "قیادہ" کا حق قبیلۂ قریش کے بنو امیہ اور بنو مخزوم کے افراد کو مکی اشرافیہ میں جاہلی اور اسلامی عہد میں فتحِ مکہ تک حاصل رہا تھا۔[۱۴۰] اس لیے وہ غیر قریشی قیادت خاص کر موالی یا جاہلی نقطۂ نظر سے "غیر شرفا" طبقہ کی قیادت کو اپنی توہین سمجھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں موالی پدر و فرزند کی تقرری سے خاص کر اور دوسرے غیر قریشی افراد کی تقرری سے عام طور پر اس جاہلی اور غیر اسلامی عقیدہ پر کاری ضرب لگائی تھی، اور صلاحیت اور لیاقت ہی کو اصل بنیادِ تقرری اور وجہِ منصب قرار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا اہم ترین سالارانِ سرایا کی عسکری قیادت کی صلاحیت سے بالعموم کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ خاص کر حضرات خالد بن ولید مخزومی، غالب بن عبداللہ لیثی، عمرو بن عاص سہمی اور ابو عبیدہ بن جراح فہری اپنی قائدانہ لیاقتوں کے لیے تاریخِ اسلام میں ممتاز و نمایاں ہیں۔

تقرری کے دوسرے عوامل

قائدوں اور امیروں کی انفرادی فوجی صلاحیت اور قائدانہ لیاقت کے علاوہ تقرری کی دوسری بنیادوں میں مہماتِ نبوی کی نوعیت، موقع و محل کی مناسبت اور اس موقع و مہم کے لیے قائدِ لشکر کی موزونیت بھی خاصی اہمیت کی حامل تھیں۔ اس کی روایتی اور واقعاتی دونوں طرح کی شہادتیں مآخذ میں ملتی ہیں۔ واقدی کی روایت ہے کہ شوال ۷ھ/فروری ۶۲۹ء میں سریہ الجناب کے موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک موزوں قائد کی تلاش

تھی۔ آخری فیصلہ سے قبل آپ نے حضرات شیخین ــــ ابوبکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ ــــ سے اس باب میں مشورہ کیا اور دونوں نے بیک وقت اور متفقہ طور سے حضرت بشیر بن سعد خزرجی انصاری کا نام تجویز کیا جسے آپ نے بلا پس و پیش قبول فرمالیا[۱۳۱]۔ اس باب میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے صرف دو ماہ قبل حضرت بشیر اسی علاقہ اور اسی دشمن کے خلاف ایک مہم لے کر جا چکے تھے اور اس میں وہ بعض روایات کے مطابق بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے تھے۔ بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ مہم میں ان کا دستہ عددی اعتبار سے بہت چھوٹا تھا کہ اس میں کل تیس مجاہد شامل تھے[۱۳۲] اور غالباً ناکامی دشمن کی غالب تعداد کے سبب ہوئی تھی، بہر کیف دوسری مہم میں ان کی فوج کی عددی طاقت کافی تھی لہٰذا وہ اس بار پوری طرح کامیاب و بامراد لوٹے۔

سریۂ نخلہ کے بارے میں جو ۲ھ/۶۲۴ء میں پیش آیا تھا ایک روایت طبری کے یہاں ملتی ہے کہ پہلے حضرت ابو عبیدہ بن جراح فہری کو اس مہم کا سالار مقرر کیا گیا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر حضرت عبداللہ بن جحش اسدی حلیفِ بنو امیہ کو کمان سونپی گئی[۱۳۳]۔

اگرچہ اس تبدیلی کا کوئی واضح سبب نہیں مذکور ہوا ہے تاہم یہ بہ آسانی معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع کے لیے حضرت عبداللہ زیادہ موزوں خیال کیے گئے تھے جبکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دونوں صحابی انفرادی طور سے قائدانہ صلاحیت سے وافر حصہ رکھتے تھے۔

غزوۂ موتہ میں حضرات زید بن حارثہ کلبی، جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی کی بالترتیب منصبِ سالاری پر تقرری ان کی موزونیت کے اعتبار سے تھی اور ان تینوں کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید مخزومی کی قیادت محض ان کی صلاحیت کے سبب جائز ہی نہیں قرار دی گئی تھی بلکہ دربارِ رسالت سے اس کی تحسین و تعریف بھی ہوئی تھی حالانکہ باشندگانِ شہر نے حضرت خالد کی فوجی حکمت عملی سے اختلاف کیا تھا اور ان پر فرار کا الزام لگا کر ان کی صلاحیت پر شک کا اظہار کیا تھا[۱۳۴]۔ فتحِ مکہ کے بعد سریۂ جزیمہ میں صحابیِ موصوف کی ایک غلطی پر تنبیہ ضرور کی گئی تھی مگر ان کی قائدانہ لیاقت سے انکار نہیں کیا

گیا تھا۔[۱۳۵] اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ بعد کی مہموں میں اسی طرح امیرِ سریہ مقرر کیے جاتے رہے۔

سریۂ ذات السلاسل کی مہم میں حضرت عمرو بن عاص سہمی کی فوجی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ان کی موقع کے لحاظ سے موزونیت بھی وجہِ تقرری بنی تھی کہ صحابیٔ موصوف بنو بلی کے ساتھ قرابت کے تعلقات رکھتے تھے جن سے مہم میں امداد و تعاون کی توقع تھی اور جو عین منشائے نبوی کے مطابق پوری ہوئی۔ اس نوع کی اور روایتیں بھی مآخذ میں تلاش کی جا سکتی ہیں مگر ان کا استقصا یہاں مقصود نہیں، مطلوب صرف یہ دکھانا ہے کہ موقع و مہم کی مناسبت اور قائد کی موزونیت بھی ایک وجہِ تقرری تھی۔

ان روایتی شہادتوں کے مقابلہ میں واقعاتی شہادتیں بہت زیادہ ہیں جو سالاران نبوی کی تقرری کے اس سبب کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں۔ اسلامی ریاست کے یہودی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے جن پانچ مہموں کو ترتیب دیا گیا تھا ان کے قائدوں کے انتخاب میں یہ اصول مدِ نظر رکھا گیا تھا کہ وہ لازمی طور سے حریف قبیلوں کے حلیف ہوں تاکہ قصاص کا مسئلہ نہ پیدا ہو۔[۱۳۶] اسی پس منظر میں حضرت ابو سفیان بن حرب اموی کے خلاف جانے والی مہم کی حضرت عمرو بن امیہ ضمری کی سالاری پر تقرری کو بھی دیکھنا چاہیے۔[۱۳۷] فتحِ مکہ کے بعد اصنامِ عرب اور قبائلی بتکدوں کو توڑنے کے لیے جو مہمیں ترتیب دی گئی تھیں ان کی کمان بھی ان کے ہی اپنے مسلم افراد یا حلیفوں کے سپرد کی گئی تھی۔[۱۳۸]

ابتدائی مہموں کے بارے میں یہ روایت بڑی مشہور ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی انصارِ مدینہ موجود و شریک نہ تھے لہٰذا فطری طور سے قیادت کی ذمہ داری مہاجرین میں سے موزوں سالاروں کو تفویض کی گئی تھی۔ قریشِ مکہ کے خلاف تمام بڑی مہموں کی قیادت خود آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اوسط درجہ کی مہموں کی سالاری خاص کر قریشی کاروانوں پر تاخت کرنے والی سرایا کی کمان زیادہ تر حضرت زید بن حارثہ کلبی کو عطا فرمائی تھی۔ عرینہ کے لٹیروں کے خلاف حضرت کرز بن جابر فہری کی تقرری کا سبب دراصل ان کی چھاپہ مار صلاحیت معلوم ہوتی ہے کہ بعینہ اسی انداز سے خود صحابیٔ موصوف نے قبول اسلام

سے قبل جنگِ بدر سے ذرا پہلے مدینہ کی چراگاہ پر کامیاب تاخت کی تھی اور دل چسپ امر یہ ہے کہ حضرت کرز اپنی اس جوابی اسلامی مہم میں بھی پوری طرح کامیاب رہے تھے[۱۳۹]۔ بنو تمیم کے خلاف ایک مہم میں حضرت عُیَینہ بن حصن فزاری کی تقرری کا سبب بنو تمیم اور ان کے قدیم حلیف بنو اسد سے ان کے پرانے دوستانہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں[۱۴۰]۔

اسی طرح مذہبی اور تبلیغی نوعیت کی مہموں میں قیادت کی بنیاد دینی بصیرت اور مذہبی جوش و ولولہ کے ساتھ ساتھ عسکری صلاحیت بھی تھی۔ چنانچہ بئر معونہ، ذاتِ رجیع، ذاتِ اطلاح اور یمن کی دو مہموں میں بالترتیب حضرات منذر بن عمرو خزرجی، مرثد بن ابی مرثد غنوی حلیفِ بنی ہاشم، کعب بن عمیر غفاری، خالد بن ولید مخزومی اور علی ابن طالب ہاشمی کی تقرریاں انھیں اسباب و عوامل کے سبب ہوئی تھیں[۱۴۱]۔ ایسی متعدد مثالیں مآخذ میں اپنے اپنے مقام میں ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔

مجموعی قبائلی تجزیہ

مذکورہ بالا بحث سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ سالارانِ سرایا کی تقرریاں اور عہدے مختلف قبائلِ عرب اور ان کے بطون میں اچھی طرح منقسم تھے، اور یہ لازمی نتیجہ تھا اس حقیقت کا کہ سالاری کا عہدہ انفرادی صلاحیت اور موقع و محل کی مناسبت سے دیا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی حکمتِ عملی کا ایک اہم پہلو اس بحث سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت میں ہر قبیلہ اور بطن کو جو اسلامی ریاست کا ہمنوا بن چکا تھا اور قائدانہ صلاحیتوں سے متصف تھا ان کے افراد کی تعداد کے مطابق اسلامی سرایا کی کمانداری و سالاری کا موقع دیا گیا تھا۔ چنانچہ قریش کی کل پچیس[۲۵] تقرریوں میں سے پانچ[۵] اور اٹھارہ[۱۸] امراء میں سے تین[۳] بنو ہاشم سے، پانچ تقرریاں اور دو[۲] امیر بنو مخزوم سے، چار تقرریاں اور اتنے ہی قائدین بنو امیہ سے اور اسی طرح تین اور دو[۲] عہدے بالترتیب بنو فہر اور بنو زہرہ سے متعلق رہے تھے جبکہ بقیہ بنو مطلب، بنو تیم اور بنو عدی کو ملے تھے۔ متعدد بطونِ قریش اس سے محروم بھی رہے تھے۔ خزرج کے قبیلہ کو اٹھارہ[۱۸] تقرریاں ان کے آٹھ امراء کو ملی تھیں

جبکہ اوس کے تین۳ قائدوں نے چھ۶ بار یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ کلب کے دو۲ فرزندوں نے دس۱۰ بار (۹+۱)، بنواسد/خزیمہ کے تین۳ امراء نے چار۴ بار، کنانہ کے چار۴ افراد نے سات۷ مرتبہ اور ازدو قیس عیلان کے دو۲ دو۲ افراد نے ایک ایک بار یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ باقی عرب قبائل میں بلی، سلیم، غطفان اور بجیلہ کو محض ایک بار سالاری کی سعادت ملی تھی[۱۴۲]

قریشی قیادت

اوپر کے تجزیہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ تقریباً ایک تہائی تقرریوں اور ایک چوتھائی سے کچھ کم امرائے سرایا کا تعلق قریش سے تھا اور یہ فطری بات تھی کیونکہ قریش نہ صرف عددی لحاظ سے پورے جزیرہ نمائے عرب کے سب سے زیادہ بڑے اور طاقتور گروہوں میں سرفہرست تھے بلکہ فوجی صلاحیتوں اور قائدانہ لیاقتوں کے لحاظ سے بھی ان کا کوئی مدِمقابل نہ تھا اور قریش میں قیادہ کے لحاظ سے سب سے بلند مقام بنوامیہ کو حاصل تھا جس کا اظہار ان کے امراء کی تعداد سے بھی ہوتا ہے یہی بات بنومخزوم اور بنوسہم کے لیے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے دو۲ نمائندے حضرات خالد بن ولید اور عمرو بن عاص مدت سے عسکری قیادت کے لیے ممتاز چلے آرہے تھے جبکہ بقیہ بطونِ قریش عسکری صلاحیتوں کے لیے اتنے ممتاز نہ تھے۔

حصۂ انصار

انصارِ مدینہ کے دونوں قبیلوں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خزرج کو اوس پر یک گونہ عددی اور فوجی برتری حاصل تھی جس کا ایک ثبوت جاہلی ایامِ عرب میں خزرج کی فتحیابی سے ملتا ہے۔ اور اس کی تصدیقِ مزید عہدِ نبوی میں ان کے افراد کی زیادہ عسکری تقرریوں سے ہوتی ہے۔

قبائلِ عرب

بقیہ قبائلِ عرب میں بنواسد اور کنانہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ عہدے غالباً

اس لیے ملے تھے کہ ان کے باصلاحیت افراد اوروں کے مقابلہ میں زیادہ تر اسلامی ریاست کے شہری بن چکے تھے۔ اسی سبب سے مدنی دورِ حیاتِ طیبہ کے نصفِ آخر میں قریش کے بنو امیہ، بنو مخزوم اور بنو سہم کو زیادہ عہدے ملے تھے جبکہ دوسرے قبائلِ عرب میں ہوازن، غطفان، کنانہ اور ازد کو ترجیح دی گئی تھی۔ اصل اصول مختلف قبائلِ عرب کے افراد میں مناسب عسکری قیادت کی موجودگی تھی۔

علاقائی نمائندگی

جہاں تک علاقائی نمائندگی کا تعلق ہے تو مرکزی عرب کے تین مسلم طبقات، قریش خزرج اور اوس کو فطری طور سے زیادہ عہدے ملے تھے کہ ان میں اسی ترتیب سے فوجی قیادت کی صلاحیت بھی تھی اور وہی امتِ اسلامی اور ریاستِ الٰہی کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ ان کے بعد مغربی اور مشرقی قبیلوں کو اسی ترتیب سے نمائندگی ملی تھی کیونکہ مرکزِ اسلام سے ان کی قربت اور اسلام سے ان کی وفاداری مہاجرین و انصار کے بعد ہی آتی تھی۔ شمالی اور جنوبی قبیلوں کو بجا طور سے اس طبقۂ افسرانِ نبوی میں قلیل نمائندگی ملی تھی کہ ان کے افراد اسلامی ریاست کے دورِ جنگ و نبرد آزمائی میں کم تھے اور اسی اعتبار سے ان کی عسکری صلاحیتیں اور قائدانہ لیاقتیں محدود تھیں۔[۱۲]

سرایا و غزوات کی عددی طاقت

موقع و محل کے لحاظ سے موزونیت و مناسبت کے ضمن میں دشمن و حریف کی فوجی صلاحیت اور اس کے اعتبار سے اسلامی مہم کی فوجی طاقت کا لحاظ اور ان دونوں عوامل کے مطابق قائد کی موزونیت بھی ایک اہم سببِ تقرری تھا۔ تمام سرایائے نبوی کا تحلیلی تجزیہ بتاتا ہے کہ عددی اعتبار سے ان کو سات خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اوّل وہ مہیں تھیں جن میں مسلم سپاہ سَو مجاہدین سے کم پر مشتمل تھیں۔ ان کی کمان جن چونتیس (۳۴) سالاروں نے کی تھی ان میں سے آٹھ قریش سے، نَو خزرج سے، پانچ اوس سے، تین کنانہ

سے اور دو دو اسد اور قیس عیلان سے متعلق تھے جبکہ باقی کا تعلق کلب، سلیم، بجیلہ، ہوازن اور غطفان سے تھا۔

دوم سو سے دو سو سپاہ پر مشتمل سات سرایا بھیجے گئے تھے ان میں سے دو دو مہموں کی تین صحابۂ کرام حضرات زید بن حارثہ کلبی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور غالب بن عبداللہ لیثی نے کمان کی تھی جبکہ باقی ایک کی سالاری حضرت ہشام بن عاص اموی کے حصہ میں آئی تھی۔

سوم۔ دو سو سے تین سو مجاہدین پر مشتمل پانچ مہمیں تھیں اور ان میں پانچ مختلف سالاروں حضرات بشیر بن سعد خزرجی، ابوعبیدہ بن جراح فہری، خالد بن سعید اموی، علی بن ابی طالب ہاشمی اور علقمہ بن مجزز کنانی نے قیادت کی سعادت حاصل کی تھی۔

چہارم وہ مہمات تھیں جن میں تین سو سے چار سو سپاہی تھے۔ ان کی کل تعداد صرف دو تھی اور ان دونوں کی سالاری حضرت خالد بن ولید مخزومی نے کی تھی۔

پنجم چار سو سے پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل تین مہموں کی قیادت تین امیروں حضرات زید بن حارثہ کلبی، خالد بن ولید مخزومی اور عمرو بن عاص سہمی نے انجام دی تھی۔

ششم۔ سات سو سپاہ پر مشتمل واحد مہم کی سالاری حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے نصیب میں آئی تھی۔

ہفتم۔ عددی اعتبار سے سب سے بڑے دو سرایا تھے جن میں تین تین ہزار مجاہد شامل تھے اور ان کی سالاری بنیادی طور سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مولیٰ حضرت زید بن حارثہ کلبی اور ایک مولیٰ زادہ حضرت اسامہ بن زید کلبی نے سنبھالی تھی، اگرچہ ان میں سے اول الذکر سریہ کی قیادت کا ثانوی اور جزوی فرض حضرات جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور عبداللہ بن رواحہ خزرجی نے بھی انجام دیا تھا۔

مآخذ کا اس پر اتفاق ہے کہ ان تمام مہموں میں مسلمانوں کو کامیابی ملی تھی اور مذکورہ بالا تجزیے سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمام امراءِ سرایا نہ صرف قائدانہ صلاحیت رکھتے تھے بلکہ وہ ان مواقع کے لیے موزوں بھی تھے۔ مختلف مواقع پر ایک ہی قائد کا انتخاب بھی اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا انتخاب موقع و محل کی مناسبت سے ہوا تھا۔[۱۱۹]

دینی مقام و مرتبہ

مسلم علماء اور عوام دونوں میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ سابقین اوّلین (سب سے پہلے یا ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کرنے والوں) کو ریاستی مناصب اور فوجی عہدے پانے کا حق ان کی سابقہ دینی خدمات اور قربانیوں کے سبب دوسروں سے زیادہ حاصل ہونا چاہیے۔ خواہ ان میں دوسرے درجہ کی تنظیمی صلاحیت اور عسکری لیاقت پائی جاتی ہو۔ اگرچہ عہد نبوی اور خلافت شیخین کے ضمن میں یہ بحث نہیں اٹھائی جاتی بلکہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس عہد مبارک میں سابقین اولین کو ترجیح دی جاتی تھی اور یہی ترجیحی پالیسی جب خلافت عثمانی میں نظر انداز یا ترک کر دی گئی اور سبقت اسلام کے لحاظ سے دوسرے درجہ کے منتظمین اور قائدین کی تقرری عمل میں آئی تو سابقین اولین کو شکوہ پیدا ہوا اور پھر اسلامی خلافت میں خرابی در آئی جس کے نتیجہ میں خلافت ہی پارہ پارہ ہو کر رہی۔[۱۰۵]

اب سوال یہ ہے کہ کیا سابقین اولین کے بارے میں حکومت نبوی کی ایسی کوئی ترجیحی پالیسی تھی یا نہیں؟ جہاں تک امرائے سرایا کا تعلق ہے ایک تجزیہ یہ واضح کرتا ہے کہ فوجی افسران نبوی کے اس طبقہ میں سابقین اولین، مومنین متوسطین اور مسلمین متاخرین تینوں طبقات کے افراد شامل تھے۔ انچاس[۴۹] امیران سرایا میں سے تیرہ[۱۳] حضرات بالکل ابتدائی مکی دور کے تھے جبکہ پانچ[۵] حضرات نے دار ارقم میں قیام نبوی کے زمانے کے بعد کسی وقت اسلام قبول کیا تھا۔ تیسرے مکی دور کا کوئی مسلم اس طبقہ میں شامل نہیں البتہ آخری مکی دور کے پندرہ[۱۵] حضرات اس طبقہ عمال میں شامل ہیں۔ مدنی حیات طیبہ کے پانچ[۵] ادوار میں سے چار[۴] امراء کا تعلق بدر کے پہلے زمانے سے ہے جبکہ بدر اور احد کے زمانے کا کوئی مسلم اس میں شامل نہیں۔ احد اور حدیبیہ کے درمیانی زمانے کے تین[۳] امیر اس طبقہ میں شامل ہیں جبکہ حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی عرصے کے چار[۴] حضرات شرکت و شمولیت کی سعادت رکھتے ہیں۔ طلقاء مکہ میں سے ایک اور فتح مکہ اور وفات نبوی کے آخری دور کے پانچ[۵] مسلم اس طبقہ افسران میں شامل ہیں۔ بقیہ چار[۴] امیروں کے بارے میں ہماری معلومات ناقص ہیں۔ مجموعی

طور سے تینتیس ۳۳ مکی عہد کے مسلم اس طبقہ میں شامل ہیں اور تقریباً سترہ ۱۷ مدنی عہد کے۔[۱۰۶]

ان اعداد و شمار کی روشنی میں یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس طبقۂ افسرانِ نبوی میں بہرحال کثرت سابقینِ اوّلین کی تھی۔ لیکن یہاں یہ بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ ان مکی امراءِ سرایا میں وہ تمام مدنی امراء بھی شامل ہیں جو بیعتِ عقبۂ اولیٰ یا بیعتِ عقبۂ ثانیہ میں ایمان لائے تھے اور اس اعتبار سے وہ مکی مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہیں ورنہ حقیقت میں وہ مدنی دور کے مسلم تھے اور ظاہر ہے کہ سبقتِ اسلام کے لحاظ سے وہ اور ان کے بعد کے ادوار کے مسلمان سابقینِ اوّلین کے ہم پلہ نہ تھے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر مواقع پر سابقینِ اولین کے مقابلے میں متوسط یا متاخر دور کے مسلمانوں کو بھی ترجیح دی تھی۔

سبقتِ اسلام اور سالاری

ابتدائی مدنی عہد میں جب آپ نے غزوات و سرایا ترتیب دئے تو آپ کو سابقینِ اولین کی ہی خدمات حاصل تھیں اور ظاہر ہے کہ آپ کو انھیں میں سے چار و ناچار اپنے فوجی افسروں اور قائدوں کو منتخب کرنا تھا۔ مگر اس سلسلے میں آپ نے الاسبق فالاسبق (یعنی سب سے اولین اور پھر ان کے بعد کے عہد کے مسلمانوں کو بہ لحاظِ ترتیب زمانہ) کا اصول نہیں اپنایا۔ غزوۂ بدر سے قبل کے چار ابتدائی سرایا میں آپ نے بالترتیب حضرات حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، عبیدہ بن حارث مطلبی، سعد بن ابی وقاص زہری اور عبداللہ بن جحش اسدی کو انتخاب فرمایا تھا جبکہ ان سے بھی قدیم اور اسبق مسلمان موجود تھے۔ حضرت زید بن حارثہ کلبی بعض روایات کے مطابق اولین مسلم تھے اور مشہور روایات کے مطابق وہ چار اوّلین مسلمانوں میں تو شامل تھے ہی مگر وہ ہجرتِ نبوی کے پورے سوا ڈو برس بعد جمادی الآخرہ ۳ھ/نومبر ۶۲۴ء میں پہلی بار سالار بنائے گئے۔ دوسرے اوّلین مسلم حضرت ابوبکر صدیق کو تو پورے سات برس بعد شعبان ۷ھ/دسمبر ۶۲۸ء میں ایک سریہ کی کمان سونپی گئی اور وہ بھی ایسے سریہ کی جو فوجی لحاظ سے بہت معمولی تھا بلکہ درحقیقت جس

کی اپنی کوئی آزاد حیثیت نہ تھی۔

دوسرے سابقینِ اولین میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو ہجرت کے چوتھے برس، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری اور حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو چھٹے برس، حضرت عمر بن خطاب عدوی کو اپنے عظیم ساتھی اور پیشرو کی مانند ساتویں برس، ہشام بن عاص اموی اور خالد بن سعید اموی وغیرہ کو آٹھویں برس یہ سعادت ملی تھی۔

اس تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولین، متوسطین اور متاخرین کو مختلف زمانوں میں بلالحاظِ توقیت و ترتیبِ زمانہ فوجی سالاری کے لیے چنا گیا تھا۔ اس بحث میں دو مثالیں بڑی دل چسپ ملتی ہیں۔ حضرات خالد بن ولید مخزومی اور عمرو بن عاص سہمی صلحِ حدیبیہ تک نہ صرف اسلامی ریاست کے دشمن بنے رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنی بھرپور عسکری صلاحیتیں اس کے خلاف استعمال کی تھیں۔ صلحِ حدیبیہ کے بعد وہ دونوں حضرات اسلام لائے اور چند ماہ ہی کے اندر اندر ان دونوں کو اسلامی سرایا کی کمان دوسرے متعدد سابقینِ اولین کے مقابلے میں عطا کی گئی۔

اسی طرح حضرات کرز بن جابر فہری، عبداللہ بن مغنم عبسی، ابان بن سعید اموی، ابوسفیان بن حرب اموی، عُیَیْنَہ بن حصن فزاری، ضحاک بن سفیان کلابی، جزء بن حدرجان ازدی، جریر بن عبداللہ بجلی جیسے بہت سے متاخرین کو سابقینِ اولین پر ترجیح دی گئی تھی اور ان کو ان کے قبولِ اسلام کے فوراً بعد ہی سالاری کے منصب سے سرفراز کیا گیا تھا۔[۳۶]

رشتہ داری اور مناصب

ریاستی مناصب کے سلسلے میں ایک اور اہم سوال بھی مسلم علماء اور عوام کے ذہنوں کو مسموم کرتا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ رشتہ داری اور قرابت ایک امرِ مانع ہے اور اس کی موجودگی میں استحقاق کے باوجود کسی کو عہدہ یا منصب نہیں دیا جانا چاہیے اور اس کو تقویٰ کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر ببانگِ دہل یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین نے اپنے زمانے میں اپنے رشتہ داروں، قرابت داروں

اور عزیزوں کو ریاستی مناصب سے دور رکھا اور اس بدعت سیئہ کا آغاز خلیفۂ سوم نے کیا۔

تاریخی تجزیہ ایسے تمام عمومی دعووں اور تاثرات کی تردید کرتا ہے۔ عہدِ نبوی میں جو امراء، سرایا مقرر کیے گئے ان میں ہم کو اچھی خاصی تعداد ان حضرات کی نظر آتی ہے جو کسی نہ کسی طور سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری رکھتے تھے۔ آپ کے پہلے دو امیر حضرات حمزہ ہاشمی اور عبیدہ مطلبی قریبی عزیز اور خون کے رشتہ دار تھے اور اوّل الذکر تو آپ کے چچا تھے۔ دوسرے قریبی اعزہ میں حضرت علی اور حضرت جعفر آپ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے تو حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی آپ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی۔ ان کے علاوہ چھ اور ایسے سالار تھے جن سے آپ کی ازدواجی رشتہ داری یا حلیفانہ قرابت تھی۔ ان میں حضرات ابوبکر تیمی، عمر عدوی اور ابوسفیان اموی آپ کے خسر تھے تو حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی آپ کی زوجہ محترمہ حضرت حفصہ کے سابق شوہر کے بھائی تھے اور حضرات زید بن حارثہ کلبی تو آپ کے متبنیٰ، مولی اور اہلِ بیت تھے اور ان کے فرزند حضرت اسامہ آپ کے مولی زادہ عزیز و قریب تھے۔

اسوۂ نبوی کی ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ داری اور قرابت کا تعلق کسی طور سے حکومتی عہدوں اور ریاستی مناصب کے لیے مانع نہیں ہے بشرطیکہ وہ صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر کیے گئے ہوں اور محض اقربا پروری اور اعزہ نوازی کی خاطر نہ کیے گئے ہوں۔

نوجوانوں کو ترجیح

ایک مصری عالم عبدالمتعال صعیدی نے اسلام کو نوجوانوں کی تحریک کہا ہے کہ اولین مسلمانوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی اور اکثر سن رسیدہ اشخاص نے یا تو اس کی مخالفت کی تھی یا اس سے گریز کیا تھا۔ بعد میں اگرچہ سن رسیدہ اور معمر و سربرآوردہ اشخاص بھی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے تاہم مسلمانوں کی غالب اکثریت نوجوانوں اور جوانوں پر ہی مشتمل رہی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس انتظامی ڈھانچے میں بھی ان کی اکثریت نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دانستہ طور سے بزرگ اور اکابر صحابہ کو کم از کم اس

صیغۂ حکومت سے بالعموم الگ رکھا تھا، اگرچہ چند مستثنیات بھی اس میں نظر آتے ہیں۔ موخرالذکر طبقہ میں حضرات حمزہ، عبیدہ اور ابوبکر صدیق وغیرہ چند بزرگوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ جبکہ بقیہ تمام سالارانِ سرایا نوجوان طبقہ کے افراد تھے اور ان میں سے بیشتر کی عمریں اٹھارہ[۱۸] بیس[۲۰] سے چالیس[۴۰] سال تک معلوم ہوتی ہیں۔[۱۵۰]

امراءِ خمیس

امرائے سرایا کی تقرری کے اسباب و عوامل پر ہماری بحث بوجوہ طویل تر ہو گئی ہے مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ دوسرے عسکری شعبوں کے عہدہ داروں اور منصب داروں کے تقرر پر بحث کرتے وقت اختصار سے کام لیا جا سکے گا۔ فوجی نظام نبوی کے دوسرے شعبوں کے افسروں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست زیرِ کمان افواج کے مختلف بازوؤں کے سالاروں کا مقام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ عہدِ نبوی میں فوجی ترتیب و تنظیم کو خمیس[۱۵۱] نظام کے نام سے جانا جاتا تھا کیونکہ عرب فوج روایتی طور سے پانچ حصوں یا بازوؤں پر مشتمل ہوتی تھی اور یہ پانچ بازو تھے: مقدمہ، میمنہ، میسرہ، قلب اور ساقہ۔ عموماً یہ سارے حصے اور بازو بڑی فوج میں پائے جاتے تھے خاص کر غزواتِ نبوی میں اور لازمی طور سے یہ بازو اپنے اپنے سالاروں کے ماتحت ہوتے تھے جو جیش کے سالارِ اعلیٰ کے نائب ہوتے تھے۔

ایسے سالارانِ جیشِ نبوی میں صرف چند کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ان میں حضرات قیس بن ابی صعصعہ خزرجی، ابوبکر صدیق تیمی، منذر بن عمرو خزرجی، عبداللہ بن جبیر اوسی، حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، زبیر بن عوام اسدی قریشی، سعد بن زید اوسی، صفوان بن معطل ذکوانی سُلَمی، اسید بن حضیر اوسی، اوس بن خولی خزرجی، قطبہ بن قتادہ عذری، عبایہ بن مالک انصاری، ابوعبیدہ بن جراح فہری، خالد بن ولید مخزومی، ورد بن خالد سلمی، ابوعامر اشعری اور عبداللہ بن عتیک خزرجی نمایاں ترین سالار ہیں۔[۱۵۲]

قبائلی اور دینی تجزیہ

ان اٹھارہ[۱۸] افسروں میں سے چھ[۶] قریشِ مکہ کے مختلف خاندانوں میں سے تھے۔

جبکہ آٹھ کا تعلق انصارِ مدینہ کے دو قبیلوں سے تھا گویا کہ مرکزی عرب کے چودہ افسر تھے جبکہ بقیہ میں سے دو مشرقی قبیلہ بنو سُلیم کے تھے۔ ایک کا تعلق جنوبی قبیلہ اشعر سے تھا اور دوسرے کا شمالی قبیلہ بنو عذرہ سے۔ جہاں تک سبقتِ اسلام کا تعلق ہے تو پانچ سابقینِ اولین میں سے تھے اور یہ سب کے سب قریشی تھے۔ تمام انصاری سالار مدنی دورِ اول کے مسلم تھے جبکہ باقی حضرات صلحِ حدیبیہ سے ذرا قبل اور بعد کے زمانے کے مسلمان تھے۔ ان افسروں میں سے چار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے عزیز یا ازدواجی رشتہ دار تھے اور سوائے دو کے باقی نوجوان طبقہ کے مسلمان تھے[۱۵۳]

محافظ فوج کے افسر

اسلامی فوج کے خیمہ گاہ اور شہرِ مدینہ کی حفاظت کے لیے جو فوجی دستے اور ان کے افسر مقرر کیے جاتے تھے ان کو مآخذ میں "الحرس"[۱۵۴] کا نام دیا جاتا ہے۔ فوجی نظامِ نبوی کے اس طبقۂ افسران میں مشہور و ممتاز ترین محافظ تھے: حضرات سعد بن معاذ اوسی، محمد بن مسلمہ اوسی، ذکوان بن عبد قیس خزرجی، عباد بن بشر اوسی، سعد بن ابی وقاص زہری، زید بن حارثہ کلبی، سلمہ بن اسلم اوسی، اسید بن حضیر اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور اوس بن خولی خزرجی[۱۵۵]

قبائلی اور دینی تجزیہ

ان کے اسمائے گرامی سے ہی یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ ان میں سے اکثر کا تعلق انصارِ مدینہ بالخصوص قبیلۂ اوس سے تھا اور یہ تمام حضرات مدنی دورِ اول کے مسلمان تھے اور نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ دونوں مہاجر افسر سابقینِ اولین کے نوجوان طبقہ کے افراد تھے اور ان میں حضرت زید بن حارثہ آپ کے متبنیٰ اور مولیٰ تھے۔ مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو محافظت کا ملکہ و مہارت قبیلۂ انصار کا طرۂ امتیاز تھا اور کچھ بیعتِ عقبۂ ثانیہ کی شرطِ وفاداری و استواری کا ان کو پاس و لحاظ تھا۔ چنانچہ انھیں اسباب سے انصاری صاحبان حرس کی اکثریت نظر آتی ہے کہ انھوں نے ایک سے زیادہ مواقع پر

بلکہ کہنا چاہئے کہ حیاتِ طیبہ کے ہر ہر نازک مرحلے پر ذاتِ نبوی، شہرِ رسول اور اسلامی خیمہ گاہ کی محافظت کا فرض انجام دیا تھا۔[۱۵۶]

معسکر کے افسر اعلیٰ

اسلامی خیمہ گاہ (معسکر) کے افسر اعلیٰ یوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کرتے تھے یا سرایا میں ان کے افسر وامیر سرایا۔ لیکن کبھی کبھی غزوات کے دوران رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی غیر حاضری کی صورت میں اپنا خلیفہ ونائب بھی مقرر فرما دیا کرتے تھے جو "سالارِ معسکر" کہلاتا تھا۔ اس طبقۂ عمالِ نبوی میں صرف حضرات علی بن ابی طالب ہاشمی، عثمان بن عفان اموی، ابوبکر صدیق تیمی اور عمر بن خطاب عدوی کے اسمائے گرامی ہی مذکور ہوئے ہیں۔ یہ اتفاق کتنا دل چسپ ہے کہ وفاتِ نبوی کے بعد یہی چاروں حضرات یکے بعد دیگرے آپ کے خلیفہ بنے۔

پہلی تقرری جو غزوۂ بنی نضیر کے زمانے میں ہوئی کے بارے میں مآخذ کا اختلاف ہے کہ اس موقع پر حضرت علی ہاشمی سالارِ معسکر تھے یا جناب صدیق اکبر تیمی۔ حضرت عمر فاروق کو خیمہ گاہ کی سالاری کا شرف غزواتِ خندق، خیبر اور فتحِ مکہ میں تین[۳] مواقع پر ملا تھا جبکہ حضرت عثمان اموی کو صرف غزوۂ خیبر میں ایک بار یہ سعادت ملی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق تیمی کو خیبر کے علاوہ غزوۂ تبوک کے عظیم ترین اسلامی لشکر کے ایک نصف کی مستقل سالاری کے ساتھ ساتھ معسکر کی سالاری اور نائب سالارِ اعلیٰ کا عہدہ بھی عطا ہوا تھا۔

ذہنی تجزیہ

اس طبقۂ عمال میں تمام حضرات سابقینِ اولین میں سے ضرور تھے تاہم ان میں سے بعض خاص کر عمر فاروق سے بھی زیادہ اسبق مسلمان موجود تھے جن کو یہ سعادت نہیں ملی تھی۔ یہ چاروں حضرات رشتہ دار بھی تھے اور کم از کم دو کا تعلق نوجوان طبقہ سے تھا۔[۱۵۷]

عرض کے افسر

عرض[۱۵۸] یا لشکر کا معائنہ ایک اہم فوجی شعبہ تھا اور متعدد غزوات کے موقع پر اسلامی لشکر کے

عرض کی شہادتیں ملتی ہیں۔ لیکن اس کے افسروں میں سے صرف دو کا نام مذکور ہوا ہے۔ ایک حضرت قیس بن ابی صعصعہ خزرجی تھے جو غزوۂ بدر میں افسرِ عرض بنے تھے۔ امکان ہے کہ وہ بعد کے دوسرے اور غزوات میں بھی اس عہدہ پر فائز رہے تھے۔[۱۵۹] البتہ غزوۂ خیبر سے حضرت زید بن ثابت خزرجی مستقل افسرِ عرض بن گئے تھے حالانکہ وہ عمر و تجربہ کے لحاظ سے خورد صحابہ میں شمار ہوتے تھے کہ اپنی تقرری کے وقت بمشکل سولہ سترہ سال کے نوجوان تھے۔ حضرت قیس خزرجی البتہ عمر و تجربہ کے لحاظ سے "سنِ رشد" کو پہنچ چکے تھے۔[۱۶۰]

ان دو مثالوں سے اس تاثر کی تصدیق و تائید ہوتی ہے کہ اعداد و شمار سے متعلق معاملات و مسائل میں مدینہ کے خزرجی حضرات کو دوسرے تمام طبقاتِ مسلمین پر ترجیح و فضیلت حاصل تھی اور بلا ریب یہ ان کی حسابی صلاحیت کے سبب تھی۔ یہ دونوں حضرات مدنی دور کے مسلم تھے اور سابقینِ اولین میں ہرگز شمار نہیں کیے جا سکتے۔

شہسوار فوج اور اس کے افسر

اسلامی فوجی نظام میں شہسوار فوج (الخیل)[۱۶۱] کا ارتقا کافی دیر سے ہوا لیکن غزوۂ احد سے باقاعدہ ایک شہسوار دستہ (الخیل) کا ذکر ملنے لگتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا ایک افسر بھی ہوتا تھا۔ عہدِ نبوی کے افسرانِ خیل میں صرف حضرات زبیر بن عوام اسدی، سعد بن زید اوسی، زید بن حارثہ کلبی، سلمہ بن اسلم اوسی اور خالد بن ولید مخزومی کے اسمائے گرامی مذکور ہوئے ہیں۔[۱۶۲] ان میں سے اول الذکر دو حضرات نے دو دو غزوات میں شہسواروں کی سالاری کی تھی جبکہ حضرات زید بن حارثہ کلبی اور سلمہ بن اسلم اوسی نے صرف غزوۂ خندق میں یہ فریضہ باری باری سے انجام دیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کے بارے میں اگرچہ تصریح تو نہیں ملتی تاہم روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے قبولِ اسلام کے بعد تمام غزوات میں افسرِ خیل رہے تھے گویا کہ یہ عہدۂ جلیلہ مستقل طور سے ۸ھ / ۶۲۹ء کے ایک نومسلم کو دوسرے سابقینِ اولین کے مقابلے میں عطا کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ عمرۃ القضیہ، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات میں وہ شہسواروں کے سالار رہے تھے اور یہ عہدہ ان کو محض ان کی فنی مہارت

وحربی بصیرت کی بنا پر عطا ہوا تھا جس کا ایک شاندار مظاہرہ وہ غزوۂ احد کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف بھی کر چکے تھے۔

ان پانچ افسرانِ خیل میں سے دو سابقینِ اولین میں سے تھے، دوسرے دو مدنی دورِ اوّل کے مسلم تھے جبکہ آخری مستقل افسر خیل متاخر مسلمان طبقہ کے نوجوان تھے۔ دوسرے افسرانِ خیل کا بھی تعلق جوان طبقہ سے تھا جبکہ ان میں سے دو حضرات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز اور رشتہ دار بھی تھے۔[۱۶۳]

صوبائی سالار

ماٰخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلامی ریاست کے انتظامی علاقے (ولایات) قائم کیے گئے تو صوبوں یا ولایات میں خاص کر یمن کے صوبے میں ایک صوبائی فوج (الجند) بھی بنائی گئی تھی اور اس کا سالار مدینہ سے روانہ کیا گیا۔ یہ حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی تھے جو حضرت خالد بن ولید مخزومی کے نہ صرف رشتہ دار وہم قبیلہ تھے بلکہ فتحِ مکہ کے زمانے کے مسلم اور طلقاءِ مکہ کے ایک فرد تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ایک نومسلم متاخر نوجوان مخزومی کو بہت سے معمر اور تجربہ کار سابقین اولین پر ترجیح دی گئی تھی کیونکہ ان کی تقرری ان کی فوجی صلاحیت وقائدانہ لیاقت کے سبب کی گئی تھی جس کے لیے ان کا خاندان شہرت رکھتا تھا۔ ان کی صلاحیت کی مزید تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ وہ اس عہدہ پر متواتر پندرہ سال یعنی خلافتِ فاروقی کے اواخر تک فائز رہے۔[۱۶۴]

علمبردار

میدانِ جنگ میں قومی یا قبائلی پرچم اٹھانا اور زمانۂ امن میں اس کی حفاظت کرنا ایک بڑا اعزاز ہونے کے علاوہ دوسرے اختیارات وامتیازات کا عہدہ بھی تھا۔ ہر قبیلہ بلکہ ہر بڑے بطن کا اپنا الگ پرچم ہوتا تھا۔[۱۶۵] اسلامی ریاست نے اس جاہلی روایت کو قبول کرکے اسے اور وسعت دی۔ چھوٹے سرایا میں عموماً ایک علم اور ایک ہی علمبردار (صاحب اللواء) ہوتا تھا جو پوری امتِ اسلامی یا ریاستِ اسلامی کی نمائندگی کرتا تھا۔ مگر بڑے غزوات وسرایا میں

مرکزی علمبردار کے ساتھ ساتھ نمائندہ قبیلوں اور بطون کے متعدد عَلَم اور عَلَم بردار ہوتے تھے۔ قبائلی علمبردار عام طور سے ان کے اپنے شیوخ اور سردار ہوتے تھے جن کو سالارِ اعظم کی تائید و تصدیق حاصل ہوتی تھی لیکن ان کے سلسلہ میں بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اختیارِ تمیزی کو استعمال کرنے کا حق رکھتے تھے۔ چنانچہ فتحِ مکہ کے موقع پر خزرج کے شیخ حضرت سعد بن عبادہ سے علم لے کر ان کے فرزند حضرت قیس بن سعد خزرجی کو اسی اختیار و حقِ نصب و عزل کے تحت عطا کیا تھا[۱۶۶]۔ قبائلِ عرب کے علمبرداروں کی تقرری چونکہ سیادتِ قبیلہ و ریاستِ بطن کی بنا پر ہوتی تھی اس لیے اس میں سبقتِ اسلام، عمر و تجربہ، مصلحت و حالات کی رعایت وغیرہ اسباب و عوامل کی گنجائش ہی نہیں پیدا ہوتی۔

مرکزی علمبردار

البتہ اسلامی ریاست یا مرکز کی نمائندگی کرنے والے علمبرداروں کا تجزیہ ہمارے مطالعہ کے لیے دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوگا۔ ابتدائی مہموں کے سات علمبرداروں کے نام ملتے ہیں، وہ ہیں حضرات ابو مرثد کناز غنوی، مسطح بن اثاثہ مطلبی، مقداد بن عمرو بہرانی، حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی، سعد بن ابی وقاص زہری، علی بن ابی طالب ہاشمی۔ حضرت حمزہؓ کو یہ اعزاز دوبار ملا۔ بلاریب یہ سب سابقینِ اولین تھے لیکن ان سے بھی اسبق مسلم موجود تھے۔ ان میں دو غیر قریشی تھے جبکہ چار قریشی تھے اور ایک کے سوا بقیہ تمام نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے[۱۶۷]۔

غزوۂ بدر کے موقع پر ایک نوجوان مسلم قریشی حضرت مصعب بن عمیر عبدری کو اس بنا پر علمِ نبوی عطا ہوا تھا کہ روایتی طور سے قریش میں علمبرداری کا حق بنو عبدالدار کو حاصل تھا اور اسلامی ریاست نے اس جاہلی روایت کو قبول و برقرار رکھا تھا۔ جہاں تک صحابیٔ موصوف کی صلاحیت و لیاقت کا تعلق ہے انھوں نے غزوۂ احد میں اسلامی پرچم کی عزت و حفاظت یوں کی کہ راہِ حق میں جان دے دی مگر اس کی بے عزتی گوارا نہ کی۔ ان کی شہادت کے بعد علمِ اسلامی ان کے بھائی حضرت ابو الروم عبدری کو ایک روایت کے مطابق اسی سبب سے عطا کیا گیا تھا[۱۶۸]۔

اسلامی ریاست کے ممتاز ترین علمبردار ہونے کا شرف حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کو جاتا ہے کہ صحابیؓ موصوف کو کم و بیش دس مواقع پر یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔[۱۹] صحابیؓ موصوف کی سبقتِ اسلام میں ذرا بھی شبہ نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عمر، اثر و رسوخ کے اعتبار سے متعدد صحابۂ کرام ان سے کہیں زیادہ فائق تھے۔

حضرت علی کی چار تقریوں کے بعد حضرت ابوبکر صدیق تیمی کو حمراء الاسد اور بنو مصطلق کے غزوات میں پرچم نبوی عطا ہوا تھا[۲۰] جبکہ خندق میں یہ شرف حضرت زید بن حارثہ کلبی کو ملا تھا۔ بنو قریظہ میں حضرت علی کو اور غزوۂ بنی غطفان میں حضرت مقداد بن عمرو بہرانی کو پرچم ملا تھا مشہور واقعہ ہے کہ غزوۂ خیبر میں حضرات ابوبکر صدیق تیمی، عمر فاروق عدوی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کو یکے بعد دیگرے قلعۂ قموص کی فتح کے موقع پر پرچم نبوی عطا ہوا تھا۔ دوسرے علمبرداروں میں سے حضرت حباب بن منذر خزرجی اور حضرت سعد بن عبادہ خزرجی اپنے قبیلے کے علمبردار تھے۔ وادی القریٰ کی مہم میں چار علمبردار حضرات: مسطح بن اثاثہ مطلبی، سعد بن عبادہ خزرجی، حباب بن منذر خزرجی اور سہل بن حنیف اوسی یا عباد بن بشر اوسی تھے۔

فتحِ مکہ میں قریشی علمبرداروں میں حضرات علی ہاشمی، زبیر بن عوام اسدی اور سعد بن ابی وقاص زہری کے علاوہ دوسرے قبائلِ عرب کے علمبرداروں میں لگ بھگ تینتیس[۳۳] اور نام ملتے ہیں جن میں سے پانچ[۵] اوس کے، نو[۹] خزرج کے، تین[۳] سلیم کے، چار[۴] مزینہ کے، چھ[۶] جہینہ کے، تین[۳] خزاعہ کے خاندانِ بنی کعب بن عمرو کے، دو[۲] اسلم کے اور ایک غطفان کے تھے۔ جبکہ غزوۂ حنین کے ضمن میں جن قبائل کے علمبرداروں کا صریحی ذکر ہوا ہے ان میں سے تین[۳] مہاجرین کے، دو[۲] خزرج کے اور ایک[۱] اوس کے تھے ظاہر ہے کہ حنین اور طائف کے غزوات میں علمبردارانِ نبوی کی کم از کم تعداد اتنی ضرور رہی تھی جتنی کہ فتحِ مکہ میں تھی بلکہ قرین قیاس ہے کہ ان کی تعداد میں فوج کی مناسبت سے اضافہ ہوا تھا۔

غزوۂ تبوک کے گیارہ[۱۱] علمبرداروں کا نام مذکور ہوا ہے ان میں سے حضرت ابوبکر صدیق تیمی اسلامی ریاست کے علمبردار تھے جبکہ اوس کے ایک اور خزرج کے آٹھ[۸] علمبرداروں کے نام شامل ہیں۔ عہدِ نبوی کی آخری مہم سریۂ اسامہ میں علمبرداری کا شرف حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی

کو ملا تھا جو ظاہر ہے کہ نہ قریشی تھے نہ انصاری اور نہ ہی سابقینِ اولین میں سے۔ اس طبقہ افسرانِ فوج میں تقرری کی بنیاد صلاحیت و لیاقت کے علاوہ موقع و محل کی موزونیت بھی معلوم ہوتی ہے۔[۱۷۱]

افسرانِ طلیعہ

اسلامی فوجی نظام میں طلیعہ (گشتی دستہ) کے شعبہ کو خاصی اہمیت حاصل تھی، کیونکہ وہ دشمنوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے اور کئی طرح سے اسلامی فوج کی مدد کرتے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرات زبیر بن عوام اسدی، علی بن ابی طالب، بسبس بن عمرو جہنی اور سعد بن ابی وقاص زہری نے اس فرض کو انجام دیا تھا۔ اس سے ذرا پہلے حضرات طلحہ بن عبید اللہ تیمی اور سعد بن زید عدوی شام سے واپس ہونے والے قریشی کارواں کا پتہ لگانے گئے تھے۔[۱۷۲] حضرات زید بن حارثہ کلبی اور عبد اللہ بن رواحہ خزرجی نے مدینہ والوں کو فتحِ بدر کی نوید سنائی تھی[۱۷۳] جبکہ غزوۂ احد میں خلفت اسلمی کے دو فرزندوں مالک اور نعمان نے مکی طاقت کا پتہ لگایا تھا۔ اسی طرح اسلم کے تین اشخاص نے قریش کی پسپا ہوتی ہوئی فوج کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔[۱۷۴]

غزوۂ بنی نضیر میں ابو لیلیٰ اسلمی اور عبد اللہ بن سلام قینقاعی نے طلیعہ کا فرض انجام دیا تھا۔[۱۷۵] ذات الرقاع میں فتح کی خوشخبری حضرت جعال بن سراقہ ضمری لائے تھے۔[۱۷۶] بنو قریظہ کو خندق کے موقع پر سعد بن معاذ اوسی، اسید بن حضیر اوسی، سعد بن عبادہ خزرجی اور خوات بن جبیر خزرجی نے ان کا معاہدہ یاد دلایا تھا۔ غزواتِ بنی لحیان، حدیبیہ، خیبر، فتحِ مکہ، حنین اور تبوک میں بالترتیب حضرات ابوبکر صدیق تیمی، عباد بن بشر اوسی، عمرو بن طفیل ازدی، محمد بن مسلمہ اوسی، علی بن ابی طالب ہاشمی، زبیر بن عوام اسدی، ابو مرثد، مقداد بن عمرو بہرانی، نہیک بن اوس خزرجی، اسید بن حضیر اوسی اور زیاد بن حنظلہ تمیمی نے یکے بعد دیگرے طلیعہ کا کام انجام دیا تھا۔[۱۷۷]

اس طبقہ میں مرکزی عرب کے تین قبائل کو زیادہ نمائندگی ملی تھی اور ان کے بعد مشرقی قبیلہ اسلم کو جبکہ بقیہ قبائل کی نمائندگی بہت کم تھی۔ بیشتر طلائع کے افسر بعد کے زمانے کے

نوجوان مسلمان تھے اور صرف چند سابقین میں سے تھے۔

عیون

اسلامی نظامِ فوج میں ایک اور اہم شعبہ فوجی جاسوسی اور سراغ رسانی کا تھا جس کے لیے متعدد جاسوس اور سراغ رساں (عیون) مقرر کیے جاتے تھے۔ غزوۂ بدر میں چاؒر سراغ رسانوں حضرات بسبس بن عمرو جہنی، عدی بن ابی الزغبا جہنی، عمار بن یاسر مذحجی اور عبداللہ بن مسعود ہذلی سے کام لیا گیا تھا۔ غزوۂ احد میں بھی اتنے ہی جاسوسوں کا ذکر ملتا ہے اور ان میں شامل تھے بنو خزرج کے حضرات انس بن فضالہ، حباب بن منذر اور قریش کے علی بن ابی طالب ہاشمی۔

غزوۂ رجیع میں یہ خدمت انجام دی تھی حضرات امیہ بن خویلد ضمری اور ان کے فرزند عمرو ضمری نے، جبکہ مریسیع کے موقع پر حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کو مقرر کیا گیا تھا۔ غزوہ خندق کے دوران حضرات خوات بن جبیر خزرجی، زبیر بن عوام اسدی اور حذیفہ بن یمان غطفانی حلیفِ اوس نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ غزوۂ حدیبیہ میں بسر بن سفیان خزاعی نے اور خیبر میں غزال بن اسود نو مسلم یہودی نے یہ کام انجام دیا تھا اور غزوۂ حنین میں انس بن ابی مرثد قیس عیلانی حلیفِ قریش اور عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی نے سراغ رسانی کا فرض نبھایا تھا۔

ان اٹھارہ سراغ رسانوں کی اکثریت کا تعلق مغربی بدوی قبیلوں سے تھا۔ وہ سب کے سب نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں پانچ ابتدائی مسلمان تھے جبکہ بقیہ آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی عہد کے مسلمان تھے اور کم سے کم چھ صلح حدیبیہ کے بعد کے مسلمان تھے۔ اس طبقۂ عمال میں ممتاز و اکابر صحابہ میں سے صرف تین چار نظر آتے ہیں جبکہ زیادہ تر غیر معروف اشخاص ہیں۔ ظاہر ہے کہ فنی مہارت اور موقع و محل کی مناسبت تقرری کی بہت اہم بنیادیں تھیں۔[۱۷۹]

دلیل و راہبر

اسی طرح فوجوں کی ان کی منازلِ مقصود تک رہنمائی کا شعبہ کافی اہم تھا اور اس کے

افسروں کو دلیل کہا جاتا تھا۔ ہجرتِ نبوی کے سفر میں تو ایک غیر مسلم عبداللہ بن اریقط دئلی نے رہنمائی کی تھی اور پھر عرج نامی مقام سے ایک مسلم راہ بر حضرت سعد العرجی یا مسعود بن ہنیدہ اسلمی کے حصہ میں یہ سعادت آئی تھی۔[١٨٠]

غزوات احد، حمراء الاسد، دومۃ الجندل، مریسیع، غطفان اور حدیبیہ میں دلالت کا کام بالترتیب حضرات ابو حثمہ اوسی، ثابت بن ضحاک خزرجی، مذکور عذری، مسعود بن ہنیدہ اسلمی، ابو حدرد اسلمی اور عمرو بن عبد نہم اسلمی نے انجام دیا تھا۔[١٨١] غزوہ خیبر کے سلسلہ میں کم از کم پانچ راہبروں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے حضرت حسیل بن خارجہ یا نویرہ اشجعی خدمت بجالانے کے وقت غیر مسلم تھے اور معاوضہ پر مقرر ہوئے تھے۔ صرف حضرت عبداللہ بن نعیم اشجعی ایک آدھ سال پرانے مسلم تھے جبکہ بقیہ تین حضرات یاسر، ابو عریض اور سماک یہودی غلام رہے تھے اور تازہ تازہ مسلمان ہوئے تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے حضرت بشیر بن سعد خزرجی کے سریہ میں بھی رہنمائی کی تھی۔ فتح مکہ میں یہ خدمت حضرت غالب بن عبداللہ لیثی نے انجام دی تھی تو تبوک کے موقع پر حضرت علقمہ بن فغواء خزاعی نے۔[١٨٢]

مذکورہ بالا چودہ پندرہ راہبروں میں بالترتیب مغربی، شمالی، مشرقی اور مرکزی عرب کے قبیلوں کو نمائندگی حاصل تھی اور ان میں چار ابتدائی مدنی یا آخری مدنی عہد کے مسلمان تھے جبکہ پانچ دوسرے صلح حدیبیہ کے زمانے کے اور باقی اس کے بعد کے مسلمان تھے۔ راہبر عموماً غیر معروف صحابہ کو مقرر کیا جاتا تھا۔ ان میں غیر مسلموں کی شمولیت دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ان کی تقرری کی بنیاد ان کی صلاحیت اور موقع و محل کے لحاظ سے موزونیت نیز دستیابی تھی۔[١٨٣]

اصحاب المغانم

فوجی نظام کا ایک اہم شعبہ عمال اموالِ غنیمت اور قیدیوں کے نگراں افسروں (اصحاب المغانم) پر مشتمل ہوتا تھا۔ غزوہ بدر میں حضرت عبداللہ بن کعب خزرجی اور حضرت شقران مولائے نبوی غنیمت اور قیدیوں کے افسر تھے۔[١٨٤] جبکہ غزوہ بنو قینقاع میں حضرات محمد مسلمہ اوسی،

عبادہ بن صامت خزرجی اور منذر بن قدامہ اوسی نے یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ غزوۂ بنو نضیر میں حضرات محمد بن مسلمہ اوسی اور ابو رافع مولائے نبوی مغانم کے افسر رہے تھے۔ مریسیع کے ضمن میں چار افسروں حضرات بریدہ بن حصیب اسلمی، شقران، محمیہ بن جزر زبیدی اور مسعود بن ہنیدہ اسلمی کا ذکر آتا ہے۔

غزوۂ بنی قریظہ میں ایسے افسروں کی تعداد آٹھ تھی جن کے نام تھے: حضرات سعد بن زید اوسی، محمد بن مسلمہ اوسی، مسلم بن بجرہ انصاری، علی بن ابی طالب ہاشمی، زبیر بن عوام اسدی، سعد بن عبادہ خزرجی، عبداللہ بن سلام قینقاعی اور محمیہ بن جزر زبیدی۔[۱۸۵] موخر الذکر اس کے بعد خیبر میں بھی غنیمت کے افسر رہے تھے۔ خیبر کے تین اور افسرِ غنائم تھے: حضرات مرداس بن مروان خزاعی، فروہ بن عمرو خزاعی اور ابوجہیمہ انصاری۔[۱۸۶]

فتح مکہ میں افسر تھے: حضرت خزاعی بن عبد نہم مزنی۔ جبکہ حنین اور اس کے بعد جعرانہ میں مالِ غنیمت کی نگرانی کم از کم سات افسروں نے کی تھی جن کے اسمائے گرامی تھے: مسعود بن عمرو غفاری / عمرو القاری، بدیل بن ورقا خزاعی، بسر بن سفیان خزاعی، زید بن ثابت خزرجی، عمر بن خطاب عدوی اور ابورہم غفاری اور حضرت علی کے سریۂ الفلس کے دوران یہ خدمت حضرت ابوقتادہ خزاعی نے انجام دی تھی۔[۱۸۷]

ان میں مرکزی عرب کے قبیلوں بالخصوص خزرج اور اوس کو کافی نمائندگی ملی تھی۔ دوسرے نمبر پر مغربی عرب کے قبیلے تھے۔ ان افسرانِ غنیمت میں پانچ سابقین اولین میں سے تھے جبکہ نو آخری مکی عہد کے اور گیارہ مدنی عہد کے اور بقیہ بعد کے زمانے کے مسلمان تھے۔ ان میں سے اکثر کا تعلق جوان طبقہ سے تھا۔[۱۸۸]

اسلحہ اور گھوڑوں کے افسر

اسلحہ اور فوجی گھوڑوں کے نگراں افسروں میں صرف چار کا ذکر مل سکا ہے۔ ان میں حضرت سعد بن اسعد خزرجی ابتدائی مدنی عہد میں ریاست کے گھوڑوں کے افسر رہے تھے جبکہ حضرات بشیر بن سعد خزرجی، اوس بن خولی خزرجی اور عبدالرحمٰن بن ازہر زہری نے بالترتیب

یہ خدمت عمرۃ القضیہ اور حنین میں انجام دی تھی۔ ان میں سے موخر الذکر کافی متاخر مسلمان تھے جبکہ بقیہ کا تعلق آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی عہد سے تھا۔[۱۸۹]

محافظ دستہ

عسکری نظامِ نبوی کا آخری شعبہ محافظین پر مشتمل تھا جو زمانۂ جنگ یا دورِ امن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ ان میں حضرت بلال حبشی اور حضرت عمار بن یاسر مذحجی کا تو شمار مہاجرین میں تھا بقیہ سولہ محافظین میں سے دس اوس کے تھے اور چھ خزرج کے۔ اوسی حضرات میں سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، قتادہ بن نعمان، عبید بن اوس، عباد بن بشر اور سلمہ بن اسلم تھے جن میں سے بعض نے ایک سے زیادہ مواقع پر یہ فریضہ انجام دیا تھا۔ خزرجی افسروں میں سعد بن عبادہ، ذکوان بن عبد قیس، حباب بن منذر، اوس بن خولی اور ابو ایوب خزرجی اہم تھے۔ ان تمام حضرات نے غزواتِ بدر، احد، حمراء الاسد، ذات الرقاع، حدیبیہ، خیبر اور وادی القریٰ کے مواقع پر ذاتِ نبوی کی حفاظت کی تھی۔ ان میں سے بیشتر ابتدائی مکی اور مدنی عہد کے نوجوان مسلمان تھے۔[۱۹۰]

اوصافِ تقرری پر ایک نظر

مذکورہ بالا تجزیاتی و تحلیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی افسروں کی تقرری کی اصل بنیاد ان کی انفرادی فوجی صلاحیت اور قائدانہ لیاقت تھی۔ تاہم کبھی کبھی موقع و محل کی مناسبت سے بھی فوجی افسروں کی تقرری کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں مہم کی نوعیت، دشمن کی طاقت، منزلِ مہم کے حالات، وقت کی ضرورت، درپیش مسائل کی ماہیت اور علاقائی سبب کو مدنظر رکھ کر موزوں ترین قائد کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اسلامی مہم کی عددی طاقت بھی موزونیت کے معاملہ کو طے کرتے کا بسا اوقات سبب بن جاتی تھی۔ مسلم مہموں میں شریک مجاہدوں کی قبائلی یا معاشرتی حیثیت بھی بعض حالات میں انتخاب کی وجہ بن سکتی تھی کیونکہ انتخاب انھیں مجاہدین تک محدود رکھنا ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر شعبہ کے تقاضوں کی رعایت

بھی تقرر کی بنیاد بن جاتی تھی مگر اس کو ہم دوسرے الفاظ میں افسرِ متعلقہ کی صلاحیت و لیاقت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

امراءِ سرایا، طلائع کے افسروں، راہ نماؤں اور سراغ رسانوں کی تقرری میں ان کی علاقائی اور جغرافیائی معلومات کو بھی بہت دخل ہوتا تھا۔ سبقتِ اسلام تقرری کی بنیادی اور اصلی وجہ نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی البتہ بعض مخصوص مواقع پر اس کی رعایت ممکن تھی۔ اسی طرح دینی بصیرت اور تعلیمی لیاقت مذہبی اور تبلیغی مہموں میں تو وجہِ تقرری بن سکتی تھیں مگر خالص فوجی مہمات میں ان کی جگہ زیادہ سے زیادہ ثانوی ہو سکتی تھی۔ معاشرتی مقام و مرتبہ اور خاندانی شرف و نجابت کا تو خیر کوئی لحاظ اسلامی فوجی نظام میں ممکن نہ تھا البتہ منزلِ مہم پر آباد قبائل کی رعایت سے کسی حد تک قبائلی تعلق کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ رشتہ داری، قرابت اور خاندانی تعلق نہ تو تقرری کی بنیاد بنتے تھے اور نہ ہی امرِ مانع تھے۔ اسی طرح عمر بھی کوئی وجہِ تقرری نہ تھی۔ عموماً نوجوانوں اور جوانوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ البتہ تجربہ و مہارت خاصی اہم بنیادیں تھیں۔ مجموعی طور سے عہدِ نبوی میں فوجی مناصب پر تقرری کی بنیاد صرف فوجی صلاحیت و لیاقت تھی اور باقی تمام چیزیں ضمنی و ثانوی تھیں۔

مالی نظام

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ میمنت لزوم سے متعلق اسلامی نظامِ اموال اور اسلام کے مالی اور اقتصادی اصولوں پر نظریاتی لحاظ سے متعدد وقیع کام جدید دور میں اہلِ علم ونظر کے سامنے آچکے ہیں[۱۹۱]۔ لیکن تاریخی اور علمی مباحث ابھی تک کافی تشنہ ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی کی جلد دوم میں "تاسیسِ حکومتِ الٰہی" کے باب میں اس مسئلہ پر کسی قدر تاریخی بحث کی ہے اور بعض دوسرے سیرت نگار اور مورخینِ اسلام نے بھی اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی ہے[۱۹۲]۔

اس سے ہماری علمی تشنگی پوری طرح دور نہیں ہو پاتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان مباحث میں تاریخی تسلسل وارتقاء اور منطقی ترتیب کا لحاظ نہیں پایا جاتا۔ مزید براں ان میں تاریخی عناصر کی کارفرمائی اور عمل دخل سے بھی بحث نہیں کی گئی ہے۔ روایات واخبار کے استقصاء، اور ان کی تنقیح وتحلیل کے فقدان، تنقیدی تجزیہ کی کمی یا عدم موجودگی اور تاریخی پس منظر اور تناظر سے بے اعتنائی کے سبب ہم عہدِ نبوی کے مالی نظام اور عمالِ صدقات وزکوٰۃ کے عزل ونصب کی پالیسی اور حکمت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔

ہماری یہ کوشش ہوگی کہ سرکاری محاصل وصدقات کی وصولیابی کے نظام کا مطالعہ کریں اور اس کے پس منظر میں عہدِ نبوی کے نظامِ مالیات پر ایک ضمنی نظر ڈالیں۔ عہدِ نبوی کے پورے مالی نظام کا مطالعہ بڑا وسیع کام ہے۔ سردست اس کے تقاضوں کو پورا کرنا مشکل ہے۔ یہاں ہماری اصل توجہ اس سوال کے جواب کی تلاش پر مرکوز رہے گی کہ عاملینِ صدقات اور دوسرے مالی افسروں کے بارے میں نبوی حکمتِ عملی کیا تھی؟ ان کی تقرری کن بنیادوں اور شرائط پر کی جاتی تھی؟ اور ان کی معزولی اور تبدیلی کی کیا بنیادیں ہوتی تھیں؟

صدقہ وزکوٰۃ کا وجوب

اصل مسئلہ پر براہِ راست گفتگو کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم صدقات وزکوٰۃ کے زمانۂ وجوب پر ایک سرسری نظر ڈال لیں کیونکہ اہلِ سیر و تاریخ اور فقہاء و محدثین کے نزدیک اس باب میں تاریخوں کا کافی اختلاف ہے۔ اس اختلاف کے سبب عاملینِ صدقات کی تقرری اور مدینہ سے روانگی کے اوقات میں تعجیل و تاخیر کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ زکوٰۃ اور جزیہ کی فرضیت کے بارے میں عام طور سے مسلم فقہاء اور علماء کا خیال یہ ہے کہ وہ فتحِ مکہ کے بعد بلکہ ۹ھ میں نافذ ہوئی تھی چنانچہ سورۂ توبہ آیت ۱۰۳ جس میں زکوٰۃ کی فرضیت کا حکمِ الٰہی ہے اور اسی سورۂ کریمہ کی آیت ۲۹ جو جزیہ کی فرضیت بتاتی ہے کے بارے میں طبری اور واحدی وغیرہ مفسرین نے بالخصوص اور دوسرے محدثین نے بالعموم اس کو ۹ھ کا واقعہ قرار دیا ہے۔[۱۹۳] ہمارے مورخین اور اہلِ سیر بھی اپنے عمومی بیانات میں زکوٰۃ و جزیہ کی فرضیت اور عاملینِ صدقات کی تقرری اور روانگی کو محرم ۹ھ کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔[۱۹۴]

لیکن تاریخی حقائق سے علماء و محدثین اور مورخین اور سیرت نگاروں کے یہ بیانات کم از کم جزیہ کے باب میں متصادم ہیں اور واقعاتی شہادتوں سے ٹکراتے ہیں۔ تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کئی برس قبل جزیہ کی فرضیت ہو چکی تھی اور وصولیابی بھی شروع ہو چکی تھی۔ دومۃ الجندل کے علاقے میں آباد بنو کلب کے عیسائیوں نے ۶ھ/۶۲۷ء میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ان کی مشہور مہم کے بعد جزیہ ادا کیا تھا۔ ۷ھ کے آغاز اور ۶۲۸ء کے وسط میں تیماء نے جو خیبر کی ایک ملحقہ یہودی آبادی تھی، اسلامی ریاست کو جزیہ ادا کرنا شروع کیا تھا۔ جبکہ خیبر، فدک اور وادی القریٰ کے مزارعین نے اپنی زمینی پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو بطورِ خراج ادا کیا تھا۔[۱۹۵]

البتہ زکوٰۃ کی وصولیابی کی تاریخ ۹ھ سے قبل عملاً ثابت نہیں ہوتی لیکن بہر حال ایسے قرائن ملتے ہیں جو فتحِ مکہ سے قبل اس کی وصولیابی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہم اس سے قبل ایک بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیماء اور قریٰ عربیہ

کے والی (گورنر) ۸ھ/۶۲۹ء میں مقرر ہو چکے تھے اور ان کے فرائض میں سے ایک صدقات کی وصولیابی بھی تھی۔[۱۹۶]
اس ضمن میں قرئی عربیہ کی مثال زیادہ اہم ہے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ حضرت معاذ بن جبل خزرجی کو جنوبی عرب کا
گورنر جنرل مقرر کرنے سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرئی عربیہ کا عامل صدقات مقرر کیا تھا اور وہ
اس علاقے سے زمینی پیداوار کا محصول وصول کر کے لائے تھے۔[۱۹۷] حضرت ولید بن عقبہ اموی کے بارے میں
آتا ہے کہ وہ بنو مصطلق کے قبول اسلام کے "دو برس بعد" اس قبیلہ کے عامل صدقات مقرر کیے گئے
تھے اور یہ قبیلہ اس لحاظ سے ۸ھ سے صدقات ادا کرنے لگا تھا۔[۱۹۸] طبری کا ایک حتمی بیان ہے کہ حضرت
عمرو بن عاص سہمی کی عمان کو بطور عامل صدقات و مرکزی منتظم روانگی فتح مکہ کے معًا بعد ۸ھ/۶۳۰ء میں ہوئی
تھی۔[۱۹۹] ان شواہد و قرائن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صدقات کی وصولیابی بالعموم اور جزیہ و خراج کی وصولیابی
بالخصوص ۸ھ/۶۲۹ء میں شروع ہو چکی تھی۔ ابن حزم وغیرہ کئی اہل سیر نے بھی ۸ھ یا ۹ھ میں زکوۃ و جزیہ کی
فرضیت کی بات کہی ہے۔

نظام وصولیابی صدقات

مآخذ سے واضح ہوتا ہے کہ محاصل و صدقات کی وصولیابی کا نظام درجہ بند اور دہرا تھا۔ جو علاقے
براہ راست مدینۂ منورہ کے ماتحت تھے ان میں مرکزی عاملین صدقات مقامی منتظمین اور عاملین کی مدد سے صدقات
وصول کرتے تھے جبکہ ولایات (صوبوں) میں اصولی طور سے وہ گورنروں کا فرض منصبی ہوتا تھا جو مرکزی عاملین کے
ذریعہ خاص حالات میں ورنہ عام طور سے مقامی عاملین کی مدد سے صدقات وصول کر کے مرکز و
دارالحکومت کو روانہ کرتے تھے۔

مرکزی عمّال

ایسے تمام عاملین صدقات جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینۂ منورہ سے براہ راست مقرر کر کے
مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بھیجتے تھے مرکزی عاملین کے زمرے میں آتے ہیں۔ عام طور سے ان مرکزی
عاملین صدقات کا تعلق علاقائی یا قبائلی لحاظ سے اپنے تقرری کے علاقوں سے نہیں ہوتا تھا لیکن بعض
مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مخصوص حالات میں علاقائی یا قبائلی تعلق کی رعایت بھی کی جاتی تھی۔ جبکہ مقامی
عاملین کا تعلق لازمی طور سے اپنے قبائل اور علاقوں سے ہوتا تھا بلکہ وہ عام طور سے اپنے قبیلوں کے

بشیوخ اور سردار ہوتے تھے۔

مقامی عمال

مرکزی عاملین صدقات اور ان کے مقامی ہم منصبوں کی کارکردگی میں یہ فرق ہوتا تھا کہ مرکزی عاملین اپنے علاقوں اور قبائل کے صدر مقام پر قیام پذیر رہتے تھے اور براہِ راست محصول دہندگان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے جبکہ مقامی افسرانِ صدقات اپنے اپنے لوگوں سے صدقات وصول کر کے مرکزی نمائندوں کو پہنچا دیتے تھے۔ کبھی کبھی مقامی عاملین صدقات مرکزی عاملوں اور افسروں کا کام کرتے تھے اور جمع شدہ صدقات براہِ راست مدینہ منورہ پہونچا دیتے تھے۔ ان کی مثالیں ہم بعد میں دیکھیں گے[۳۰]۔

مستقل عہدہ دار

اکثر و بیشتر مرکزی عاملین صدقات مستقل عہدہ دار ہوتے تھے اور عام طور سے ایک متعین قبیلے یا مخصوص علاقے کے افسر محاصل مقرر کیے جاتے تھے چنانچہ حضرات عمرو بن عاص سہمی، عنبہ خزرجی، ابی بن کعب خزرجی، عباد بن بشر خزرجی، بریدہ بن حصیب اسلمی، رافع بن مکیث جہنی، عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، ضحاک بن سفیان کلابی، حذیفہ بن یمان ازدی، قضاعی بن عمرو عذری اور متعدد دوسرے عاملین مستقل عہدہ دار تھے جو اپنے اپنے عہدوں پر وفاتِ نبوی تک کام کرتے رہے۔ متعدد مآخذ کی روایات کی تنقیح و تحلیل سے تقریباً تیس[۳۱] مرکزی عاملین صدقات کا ذکر ملتا ہے۔ ذیل میں ان کی فہرست ان کے علاقوں اور قبیلوں سمیت دی جا رہی ہے۔

نمبر شمار	عاملِ صدقات	علاقہ/قبیلۂ تقرری
۱۔	حضرت ابی بن کعب خزرجی	سعد ہذیم/جذام
۲۔	" عنبہ خزرجی	"
۳۔	" ولید بن عقبہ اموی	بنو مصطلق

نمبرشمار	عاملِ صدقات	علاقہ/قبیلۂ تقرری
۴-	حضرت عباد بن بشر اوسی	بنو مصطلق
۵-	" عمرو بن عاص سہمی	ہوازن/حنین، غطفان/فزارہ، قضاعہ اور عمان۔
۶-	" کلاب بن امیہ لیثی	ثقیف
۷-	" سالف بن عثمان بن معتب ثقفی	"
۸-	" بسر بن سفیان عدوی قریشی	خزاعہ/کعب
۹-	" بریدہ بن حصیب اسلمی	غفار و اسلم
۱۰-	" رافع بن مکیث جہنی	جہینہ
۱۱-	" عباد بن بشر اوسی	مزینہ اور سلیم
۱۲-	" ضحاک بن سفیان کلابی	کلاب/عامر بن صعصعہ
۱۳-	" معاذ بن جبل خزرجی	قریٰ عربیہ
۱۴-	" عکرمہ بن ابی جہل مخزومی	ہوازن
۱۵-	" حذیفہ بن یمان ازدی	ازد
۱۶-	" معاویہ بن ابی سفیان اموی	اقیال حضر موت
۱۷-	" عیینہ بن حصن فزاری	تمیم
۱۸-	" ابن اللتبیہ ازدی	بنو ظبیان
۱۹-	" سنان بن ابی سنان اسدی	بنو مالک
۲۰-	" قضاعی بن عمرو عذری	بنو حارث
۲۱-	" عکرمہ بن خصفہ ہوازنی	بدیل، بسر اور ان کے حلیف قبائل
۲۲-	" عبادہ بن صامت خزرجی	-
۲۳-	" ارقم بن ابی الارقم مخزومی	-
۲۴-	" حضرت زیاد بن حنظلہ تمیمی	-

نمبر شمار	عامل صدقات	علاقہ/قبیلہ تقرری
۲۵۔	حضرت عمر بن خطاب عدوی قریشی	-
۲۶۔	" عبداللہ بن خطل ادرم بن غالب	-

مذکورہ بالا عاملین صدقات میں سے موخر الذکر پانچ حضرات کی تقرری کے بارے میں تصریح نہیں ملتی تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ مرکزی عاملین میں شامل تھے۔ ان میں سے سب سے آخری عامل مرتد ہو گئے تھے اور اس سبب سے فتح مکہ میں قتل کر دئے گئے تھے۔

عمال کی تقرری کے سلسلہ میں بعض دل چسپ تفصیلات ملتی ہیں جو نبوی پالیسی کی وضاحت کرتی ہیں۔ چنانچہ حضرات ابی بن کعب خزرجی اور عنبہ خزرجی کے بارے میں آتا ہے کہ ان دونوں کو قبیلۂ جذام کے بطن سعد ہذیم کے مسلمانوں پر مشترکہ طور سے عاملین صدقات مقرر کیا گیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ والوں کو حکم دیا تھا کہ ان کی اطاعت کریں اور ان کو صدقات ادا کریں۔[۲۰۱]

حضرت ولید بن عقبہ اموی

حضرت ولید بن عقبہ اموی کی بحیثیت عامل صدقات تقرری، کارکردگی اور کردار پر بڑی دل چسپ اور مختلف فیہ بحث مآخذ میں ملتی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ بنو مصطلق کے اسلام قبول کرنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ولید کو ان کا عامل صدقات مقرر کیا۔ چنانچہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے علاقۂ بنو مصطلق کو روانہ ہوئے جب وہ ان کے علاقے کے قریب پہونچے تو بنو مصطلق کی ایک جماعت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ان کو خدشہ پیدا ہوا اور وہ الٹے پاؤں واپس مدینہ پہونچے اور سارا ماجرا خدمت نبوی میں عرض کر دیا۔ ان کی خبر پر اعتماد کر کے مسلمانان مدینہ نے بنو مصطلق پر فوجی تاخت کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ بنو مصطلق کا ایک وفد اپنی معروضات لے کر مدینہ جا پہونچا اور اس خدشہ کو بے بنیاد قرار دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کے بیانات سن کر اسے قبول کر لیا اور پھر بنو مصطلق کی خواہش پر حضرت عباد بن بشر اوسی کو ان کا عامل صدقات مقرر کیا جو ان

سے پوری حیاتِ نبوی کے دوران صدقات وصول کرتے رہے۔

بعض روایات میں حضرت ولید بن عقبہ اموی پر عمداً کذب وافترا کا الزام لگایا گیا ہے اور بعض مفسرین نے سورۂ حجرات کی آیت ۶ میں لفظ فاسق کا مصداق بھی ان کو قرار دیا ہے لیکن یہ تمام الزامات نقد وجرح کے معیار پر کھرے نہیں اترتے[۲۰۲]۔ طبری کی روایات سے ایسا تاثر ہوتا ہے کہ وہ بعد میں حیاتِ نبوی ہی میں قضاعہ کے نصف حصہ پر عاملِ صدقات بنا دیئے گئے تھے اور بہر حال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ خلافتِ صدیقی وفاروقی میں وہ عاملِ صدقات اور گورنر کے اہم عہدوں پر مسلسل فائز رہے تھے جس کے بعد وہ خلافتِ عثمانی میں کوفہ کے گورنر مقرر کیے گئے۔ یہ ان کی دیانت داری، صلابتِ ایمانی اور فرضِ منصبی کو بخوبی انجام دینے کی ناقابلِ تردید شہادت ہے اور جہاں تک ان کے خلاف بنو مصطلق کے معاملہ میں الزامات کا تعلق ہے تو اس کا جائزہ دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ لیا جا چکا ہے[۲۰۳]۔

طبری کی روایت سے جو تاثر ملتا ہے وہ اگر صحیح ہے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو مصطلق کے معاملہ کے بعد ان کو بنو قضاعہ کے علاقے میں تبدیل کر کے بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ خلافتِ صدیقی کے آغاز تک عاملِ صدقات رہے۔

واقدی اور ابن سعد وغیرہ کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ اموی کے جانشین حضرت عباد بن بشر اوسی نے کسی وقت مزینہ اور سلیم کے صدقات بھی وصول کیے تھے[۲۰۴]۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے دونوں علاقوں میں یہ فریضہ بیک وقت انجام دیا تھا یا دو مختلف اوقات میں، اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں علاقوں میں یہ فرض یکے بعد دیگرے انجام دیا تھا۔ بہر کیف یہ حقیقت مسلم ہے کہ وہ مستقل مرکزی عاملِ صدقات تھے۔

حضرت عمرو بن عاص سہمیؓ

مرکزی عاملینِ صدقات میں حضرت عمرو بن عاص سہمی کا معاملہ کافی دلچسپ بھی ہے اور منفرد بھی۔ فتح مکہ کے بعد ان کو عمان کا عاملِ صدقات اور مرکزی منتظم بنا کر بھیجا گیا۔ سنہ ۸ھ

میں ہم ان کو ہوازن کے علاقے میں صدقات وصول کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اسی زمانے میں انھوں نے غطفان کے ایک اہم ترین بطن بنوفزارہ سے صدقات وصول کیے تھے اور اس کے بعد طبری کی ایک روایت کے مطابق ان کو قضاعہ کا عاملِ صدقات مقرر کیا گیا تھا اور ان کے شریکِ کار حضرت ولید بن عقبہ اموی تھے جو بقیہ نصف قبیلہ کے عامل بنائے گئے تھے۔ غالباً یہ انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ قضاعہ کا قبیلہ کافی بڑا تھا اور وسیع علاقے میں آباد تھا۔

ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی مدت تک اس علاقے میں مقیم رہ کر اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے اور پھر سنہ ۱۰ھ / ۶۳۱ء میں حجۃ الوداع کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ صرف عمان کے علاقے میں دوبارہ عاملِ صدقات بنا کر بھیجا بلکہ ان سے وعدہ بھی کیا کہ اس فریضہ کی انجام دہی کے بعد ان کو واپس پھر قضاعہ کے علاقہ میں تعینات کر دیا جائے گا۔ یہ وعدہ وفاتِ نبوی کے سبب حیاتِ نبوی میں پورا نہ ہوا مگر حضرت ابوبکر صدیق نے ان کو اپنی خلافت کے شروع ہی میں قضاعہ کا عامل پھر مقرر کر دیا تھا[۲۰۵]۔ حضرت عمرو بن عاص سہمی کی بطورِ عاملِ صدقات تقرری چار علاقوں میں کی گئی تھی جو ان کی طویل مدتِ تقرری، صلاحیت ولیاقت اور فرضِ منصبی میں مستعدی اور کارکردگی کو واضح کرتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ

علامہ کتانی نے کلاعی کی سیرت پر انحصار کر کے دعویٰ کیا ہے کہ خاص مدینۂ منورہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افسرِ صدقات حضرت عمر بن خطاب عدوی تھے اور محدث ابوداؤد کا یہ بیان اس تقرری کی بالواسطہ تائید کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس خدمت کے بجالانے کے لیے کچھ تنخواہ یا معاوضہ (عمالہ) ملا تھا۔ یہاں اسد الغابہ کا ایک حوالہ دلچسپی کا حامل ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینۂ منورہ کے ایک نصرانی کی آدھی دولت اس جرم میں ضبط کر لی تھی کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابن اثیر کا یہ بیان موجودہ صورت میں ناقابلِ قبول ہے اس لیے کہ اسلام قبول کرنے سے

انکار پر کوئی تعزیر عائد نہیں ہوتی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا بیان میں اسلام کے عدم قبول کے بعد جزیہ کی عدم ادائیگی کا ذکر کسی سبب سے رہ گیا ہے یا اس تعزیر کا سبب کوئی دوسرا جرم تھا۔ بہرحال اگر حضرت عمرؓ مدینۂ منورہ کے افسرِ صدقات تھے تو ان کے فرائض میں صدقاتِ مسلمین کے علاوہ غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی بھی شامل تھی اور مذکورہ بالا حوالہ کا تعلق اسی فرض کی انجام دہی سے جوڑا جا سکتا ہے۔[۲۸۶]

ہوازن کے عمال

علاقۂ ہوازن و حنین کے بارے میں ہم کو تینؔ افسرانِ صدقات کی تقرری کا ذکر ملتا ہے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ حضرت سائف بن عثمان بن معتب ثقفی کو مدینۂ منورہ سے جہاں وہ ہجرت کر کے بس گئے تھے، ثقیف کے صدقات وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا جبکہ حضرت کلاب بن امیہ لیثی کو اونٹوں کی زکوٰۃ (عشور) کا افسر بنا کر روانہ کیا گیا تھا۔ ابن سعد، طبری اور ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل مخزومی کو حیاتِ نبوی کے آخری برس ہوازن کا عاملِ صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ تینوں حضرات مرکزی افسرانِ صدقات تھے کیونکہ ہم کو ہوازن کے مختلف بطون (خاندانوں) کے مقامی عاملینِ صدقات کا ذکر ملتا ہے جن کے کام کی نگرانی علاقہ کے گورنر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کرتے تھے۔[۲۸۷]

حضرت بریدہ بن حصیب

حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کے بارے میں ایک دلچسپ روایت ملتی ہے جس کے مطابق ایک اسلمی نوجوان نے فتح مکہ کی مہمِ نبوی میں جہاد کی غرض سے شرکت کرنی چاہی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایمان و اسلام کا امتحان لیا اور اس موقع پر حضرت بریدہ نے اس نوجوان کی وفاداری کی تصدیق یوں کی کہ اس نے اپنے ذمہ واجب صدقات اسلامی حکومت کو ادا کر دئے ہیں اور خود انھوں نے یہ وصول یابی کی ہے۔

بزورِ شمشیر وصولیابی

مرکزی عاملِ صدقات کی تقرری کا ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت بسر بن سفیان عدوی قریشی کو خزاعہ کے ایک خاندان بنو کعب سے صدقات کی وصولیابی کے لیے روانہ کیا گیا۔ وفادار و جاں نثار بنو کعب نے صدقات ادا بھی کرنا چاہے مگر ان کے سرکش پڑوسی قبیلہ بنو تمیم نے صدقات ادا کرنے کو اپنے لیے باعثِ عار اور مستقبل کی مستقل آفت جانا چنانچہ انھوں نے حضرت بُسر کو ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج حضرت عیینہ بن حصن فزاری کی سرکردگی میں روانہ کی جس کا مقصد مانعینِ زکوٰۃ کو سزا دینا اور وفادار خزاعیوں سے صدقات وصول کر کے لانا تھا اور انھوں نے بحسن و خوبی اپنا یہ فرض انجام دیا۔ حضرت عیینہ بن حصن فزاری کی بطور مصدق تقرری عارضی اور وقتی تھی جبکہ حضرت بسر بن سفیان کی تقرری مستقل تھی۔

حضرت معاویہ اموی

اسی نوعیت کی عارضی تقرری حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کی تھی جن کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۂ منورہ سے حضر موت کے ایک قَیل (شہزادے / حکمراں) حضرت وائل بن حجر حضرمی کے ساتھ حضر موت بھیجا تھا تاکہ وہ اس علاقے کے تمام اقیال (حکمرانوں) سے صدقات و جزیہ وصول کر کے لائیں۔ حضرت معاویہ نے یہ فرض انجام دیا تھا لیکن مآخذ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے دوبارہ بھی یہ فرض انجام دیا تھا یا نہیں۔ اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ حیاتِ نبوی میں ان کی بطور عامل تقرری عارضی اور وقتی تھی۔[۳۶]

مرکزی عاملین صدقات کے بارے میں مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں اب پورے اطمینانِ قلب اور تیقن کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کی تقرری مستقل ہوتی تھی اور وہ اپنے مخصوص علاقہ یا متعین قبیلہ کے صدقات وصول کر کے مدینۂ منورہ لاتے تھے۔ البتہ بعض عاملینِ صدقات ایسے تھے جن کو مخصوص حالات میں عارضی طور سے اس

عہدہ پر مقرر کیا جاتا تھا اور وہ اپنا فرض انجام دینے کے بعد عہدہ سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔

مختلف علاقوں کے عمّال

بعض مرکزی عاملینِ صدقات کے بارے میں ایک دلچسپ صورت یہ نظر آتی ہے کہ وہ عاملِ صدقات کے عہدہ پر فائز تو مستقل طور سے ہوتے تھے لیکن ان کی کارکردگی کا علاقہ اور جولان گاہ بدلتی رہتی تھی۔ اس کی بہترین مثال حضرت عمرو بن عاص سہمی کی ہے جو چار پانچ علاقوں میں اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ پہلے انھوں نے ہوازن اور حنین کے علاقے میں صدقات وصول کیے پھر غطفان/فزارہ کے علاقے میں گئے۔ اس کے بعد نصفِ قضاعہ پر مقرر ہوئے۔ وہاں سے عمان بھیجے گئے اور پھر عمان سے واپس قبیلہ قضاعہ کے علاقے میں مقرر ہوئے۔

ان کے ہم عہدہ اور پڑوسی حضرت ولید بن عقبہ اموی تھے جو بنو مصطلق کے علاقے سے تبدیل ہو کر دوسرے نصفِ قضاعہ کے عامل مقرر ہوئے اور بقیہ مدت تک وہیں مقیم رہے۔

اسی طرح حضرت عباد بن بشر اوسی نے دو مختلف اوقات میں پہلے بنو مصطلق کے صدقات وصول کیے اور پھر مزینہ اور سلیم کے عامل بنے۔

ظاہر ہے کہ ان عمالِ صدقات کے علاقوں اور قبیلوں کی تبدیلی مخصوص حالات اور اسباب کے سبب ہوئی تھی اور ان کو ان علاقوں میں تقرری کے لیے دوسرے اصحاب سے زیادہ موزوں سمجھا گیا تھا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ذاتی اور انفرادی صلاحیتوں کے علاوہ حالات و واقعات کی رعائت یا قبائل و بطون سے تعلقات اور ان کی مرضی کو بھی تقرری کے وقت دھیان میں رکھا جاتا تھا اور ایسا ہر انتظامیہ کے لیے ضروری بھی ہے کیونکہ اسی صورت میں وہ صحیح طور سے کام کر سکتی ہے اور خاطر خواہ ثمرات و فوائد بھی حاصل کر سکتی ہے۔[۲۹]

قبائلی تجزیہ

مذکورہ بالا مرکزی عاملینِ صدقات کے قبیلہ وار تجزیے سے بعض دلچسپ نکات

روشنی میں آتے ہیں۔ چنانچہ اٹھائیس[۲۸] معلوم تقرریوں پر صرف چوبیس[۲۴] افراد کا تقرر ہوا تھا اور ان میں سے ایک تہائی کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا۔

بطونِ قریش میں بنو امیہ، بنو سہم، بنو عدی اور بنو مخزوم کے ممتاز ترین افراد کو تقرری ملی تھی۔ ان میں بنو امیہ کے دو[۲] مختلف خاندانوں کے افراد حضرات ولید بن عقبہ اور معاویہ بن ابی سفیان تھے۔

بنو سہم کے واحد نمائندے حضرت عمرو بن عاص ان سب میں سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ابتدائے تقرری سے وفاتِ نبوی تک نہ صرف یہ کہ اس عہدہ پر مستقل طور سے کام کیا تھا بلکہ مختلف علاقوں اور قبیلوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

بنو عدی کے بھی دو[۲] نمائندے حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت بسر بن سفیانؓ تھے۔ ان میں سے اول الذکر کی تقرری بوجوہ بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ بالکل یہی حال بنو مخزوم کے واحد نمائندے حضرت عکرمہ بن ابوجہل کی تقرری کا ہے کہ وہ فتح مکہ تک اسلام کے سخت دشمن رہے تھے اور اسی سبب سے قریش کے اشتہاری مجرموں میں شامل تھے اور پھر وہ نہ صرف عفوِ نبوی کے مستحق بنے بلکہ کرمِ نبوی کے بھی حق دار ثابت ہوئے۔ بقیہ قریشیوں میں عبداللہ بن خطل کا نام بھی شامل ہے جو بنو ادرم سے تھا اور اپنے ارتداد اور جرمِ قتل کے سبب مقتول ہوا۔

قریش کے بعد عددی اعتبار سے بنو خزرج کا درجہ ہے جس کے چار[۴] عاملوں ــ حضرات ابی بن کعب، عنبسہ، معاذ بن جبل اور عبادہ بن صامت ــ نے یہ خدمت انجام دی تھی۔ اگرچہ اوس کے صرف ایک عامل ــ حضرت عباد بن بشر ــ کا ذکر ملتا ہے تاہم ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کہ انھوں نے خاصے طویل عرصے تک اور مختلف علاقوں میں اس عہدہ پر کام کیا تھا۔

قبائلِ عرب میں قبیلۂ ازد کے دو[۲] عامل حضرات حذیفہ بن یمان اور ابن اللتبیہ تھے جبکہ عذرہ فزارہ/غطفان، کلاب، اسد، قیس عیلان، ثقیف، کنانہ، خزاعہ، جہینہ اور تمیم کے صرف ایک ایک فرد کا نام مل سکا ہے۔

علاقائی تجزیہ

علاقائی اعتبار سے اگر تجزیہ کیا جائے تو مرکزی اور وسطی عرب کے تیرہ[۱۳] عامل تھے۔ یعنی

معروف عمال کا تقریباً پچاس فیصد ان پر مشتمل تھا جبکہ شمالی عرب کے صرف ایک عامل تھے اور مشرقی و مغربی عرب کے بالترتیب پانچ اور تین نمائندے تھے۔ جنوبی عرب کا بھی ایک ہی نمائندہ تھا اور اسی طرح مختلف منتشر قبائل کا بھی نمائندہ ایک ہی تھا۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ ان مختلف علاقائی اور قبائلی افراد کا نسبی تعلق ان علاقوں سے تھا تاہم عملاً وہ مدینۂ منورہ کے باشندے اور وسطی عرب کے متوطن تھے کہ وہاں وہ حِلف اور ولاء کے رشتوں سے بندھے تھے اور خدمتِ نبوی میں حاضر رہتے تھے۔[۲۱]

عُمّال کی کثرت

یہاں ایک دوسری اہم حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے وہ یہ مذکورہ بالا عاملینِ صدقات ہی مرکز کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے علاوہ متعدد اور افراد بھی مختلف قبیلوں اور علاقوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندگی کرتے تھے۔ حافظ ابنِ قیم کا یہ تبصرہ بڑا حقیقت افروز ہے کہ جتنے قبائل و بطون عرب تھے اتنے ہی عاملینِ صدقات تھے۔ اس پر مزید اضافہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ عاملین کا تناسب قبائل و بطون کے مقابلے میں بڑھ ہی سکتا ہے کم نہیں ہو سکتا کیونکہ بسا اوقات بڑے قبائل اور بطون کے لیے ایک سے زیادہ عامل مقرر کیے گئے تھے اور کبھی کبھی ایک ہی قبیلہ یا علاقہ کے لیے بیک وقت دو حضرات کا تقرر ہوا تھا جیسا کہ حضرات ابی بن کعب اور عنبہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

دینی تجزیہ

جہاں تک ان مرکزی عاملینِ صدقات کے زمانۂ قبولِ اسلام یا سبقتِ ایمان کا تعلق ہے تو ان میں سے بیس[۲۲] فیصد اولین مسلمان یعنی سابقین تھے۔ دوسرے بیس فیصد کے قبولِ اسلام کا تعلق آخری مکی عہد یا ابتدائی مدنی زمانہ تھا جبکہ بقیہ ساٹھ فیصد عاملین کے قبولِ اسلام کا تعلق صلحِ حدیبیہ کے بعد بلکہ فتحِ مکہ کے زمانہ سے ہے۔ اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ایمان و اسلام، انفرادی تنظیمی اور انتظامی صلاحیت، حالات کی رعائت اور علاقوں اور قبیلوں کی سیاست تو کسی مرکزی

عامل صدقات کی تقرری کا سبب بن سکتی تھی لیکن محض بسبقتِ اسلام عہد نبوی کے انتظامیہ میں نہ تو کبھی تقرری کا محرک ہوئی اور نہ فی الواقع ہو سکتی تھی[۲۱۱]

مقامی عمال

نبوی عاملین صدقات کی درجہ بندی کے دوسرے مرحلہ میں مقامی افسرانِ محصول آتے ہیں۔ ان کا میدانِ عمل اور دائرۂ کار ان کے اپنے قبیلوں، بطون اور خاندانوں تک محدود تھا۔ عموماً یہ افسرانِ محاصل اپنے قبیلہ یا بطن والوں سے صدقات خود وصول کرتے تھے اور مرکزی عاملین صدقات کے حوالے کرتے تھے۔ لیکن بہرحال ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ مرکزی عمال کی محصول دہندگان سے براہِ راست صدقات کی وصولیابی میں بھی مدد کرتے ہوں۔ مقامی عاملین صدقات عام طور سے اپنے اپنے قبیلوں، بطون اور خاندان کے سردار و شیوخ ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ/قوم کے صدقات پر متعین کیے گئے تھے (علی صدقات قومہ) مگر ان کے بارے میں قبیلہ یا خاندان کی سرداری کی صراحت نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ان تمام افسرانِ نبوی کو بھی مقامی عمال میں شمار کرنا چاہیے جن کا شمار ہم مقامی منتظمین اور سرداروں میں کر چکے ہیں۔ وہاں یہ صراحت آ چکی ہے کہ مقامی منتظمین اور شیوخ قبائل کا ایک فرضِ منصبی یہ بھی تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں سے صدقات وصول کر کے مرکزِ اسلام تک پہونچائیں یا مرکزی عاملین صدقات کے حوالے کریں۔

مقامی عُمال مرکزی عاملین کی طرح یا ان سے کچھ زیادہ ہی مستقل عہدہ دار ہوتے تھے کیونکہ ان کی مدتِ تقرری عام حالات میں تاحیات ہوتی تھی اور ان کا دائرۂ کار بھی تبدیل نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف اپنے لوگوں (قوم) کے افسرانِ صدقات ہوتے تھے۔ نظریاتی لحاظ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقامی عاملین کو تبدیل یا معزول کر سکتے تھے تاہم کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ آپ نے عملاً اپنے اس حق کا استعمال کیا ہو[۲۱۲]

تقرری کے طریقے

مقامی عمال کی تقرری میں عموماً دو طرح کے طریقوں کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ

قبیلہ کے سابق سربراہ اور شیخ کو اس کے عہدہ پر برقرار رکھتے تھے اور اس کو صدقات کی وصولیابی کا ذمہ دار بنا دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ خدمتِ نبوی میں حاضر ہونے والے وفد کے سربراہ یا ممتاز ترین فرد یا افراد کو صدقات کی وصولیابی کی ذمہ داری سونپ دیتے تھے۔ وفودِ عرب کی سربراہی عموماً قبیلہ و بطون کے سرداری کرتے تھے لیکن ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں قبیلہ/بطن کا کوئی دوسرا ممتاز فرد یہ فرض انجام دیتا تھا اور چونکہ اس کو قبیلہ/بطن کا اعتمادِ عام حاصل ہوتا تھا اس لیے انتظامی سہولت کے پیشِ نظر آپ اسی کو مقرر کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ نے کسی سابق شیخ قبیلہ کی جگہ دوسرا سردار مقرر فرمایا ہے مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔[۲۱۳]

صدقات کی وصولیابی

یہ امر کہ مقامی عاملینِ صدقات اپنی قوم کے صدقات وصول کر کے مرکزی عمال کے حوالے کرتے تھے متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی کے بارے میں ذکر آچکا ہے کہ ان کے قبیلہ کے ایک سربرآوردہ شخص نے جو غالباً شیخ خاندان تھا اپنے صدقات ادا کیے تھے۔[۲۱۴] اس سے واضح مثال بنو مصطلق کے بارے میں ملتی ہے کہ شیخ قبیلہ حضرت حارث بن ضرار خزاعی نے اپنے قبیلہ کے صدقات وصول کر کے پہلے حضرت ولید بن عقبہ اموی کو ادا کرنے چاہے جو بوجوہ ان کے حوالہ نہ کر سکے اور پھر بعد میں دوسرے مرکزی عامل حضرت عباد بن بشر کے حوالے کیے۔[۲۱۵] اسی طرح بنو الاصبغ کے سردار حضرت امرؤ القیس بن الاصبغ کلبی نے اپنے صدقات مرکزی نمائندے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہری کے سپرد کیے تھے۔[۲۱۶]

بحرین کے حکمراں اور مقامی منتظم حضرت منذر بن ساوی کو حکمِ نبوی تھا کہ وہ اپنے علاقہ کے صدقات دو مرکزی نمائندوں حضرات ابوہریرہ دوسی اور قدامہ کو ادا کریں یہی نظم عمان، ہجر اور حضر موت و یمن کے مختلف علاقوں کے لیے کیا گیا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل خزرجی جو گورنر جنرل تھے اپنے ماتحت گورنروں سے اور وہ اپنے مقامی عاملوں سے صدقات وصول کرتے تھے۔ ایک گرامی نامۂ نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت وائل بن حجر حضرمی کو جو ایک قیل/حکمراں تھے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ حضر موت کے دوسرے اقیال سے صدقات وصول کر کے مرکزی نمائندوں کے حوالے کر دیں۔

اسی طرح قبیلہ عبدالقیس کے شیخ حضرت اکبر بن عبدالقیس نے اپنے قبیلہ کے علاوہ ازدِ عمان کے صدقات وصول کر کے مرکزی منتظم حضرت علاء بن حضرمی کے حوالے کیے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن کا ذکر طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جا رہا ہے [۲۱۶]

قبائلی تجزیہ

جہاں تک مقامی عاملینِ صدقات کی کل تعداد کا تعلق ہے تو کچھ پہلے ہم حافظ ابنِ قیم کی رائے دیکھ چکے ہیں اور وہ مقامی عاملوں پر زیادہ صادق آتی ہے کہ اتنے ہی مقامی عامل تھے جتنے کہ قبیلے یا ان کے بڑے خاندان۔ بہرحال ایک تجزیاتی مطالعہ سے کم از کم تینتیس [۲۱۷] مقامی عاملوں کے نام سامنے آئے ہیں جو معروف و مشہور تھے۔ ان میں سے تین کا تعلق شمالی قبائل سے، سات کا مشرقی قبائل سے، دو کا مغربی قبائل سے اور گیارہ کا منتشر قبائل سے تھا۔

دینی تجزیہ

ان میں سے دو چار کے سوا بقیہ آخری زمانے کے مسلمان تھے اور دو چار حضرات بھی وسط مدنی زمانہ یا صلحِ حدیبیہ کے قریب کے زمانہ کے مسلمان تھے۔ صرف ایک آدھ کو ابتدائی مدنی عہد کا مسلمان قرار دیا جا سکتا ہے [۲۱۸]

مقامی عمالِ صدقات میں حضرات عدی بن حاتم طائی، ابن الاصبغ کلبی، جندب بن مکیث جہنی، حارث بن ضرار خزاعی، زبرقان بن بدر تمیمی، مالک بن نویرہ تمیمی اور ان کے بھائی متمم اہم ترین اور معروف عمال ہیں۔ عذرہ کے عاملِ صدقات حضرت ہوزہ بن نعمان، طے کے عامل حضرت عدی بن حاتم طائی، بنو کلب کے حضرت ابن الاصبغ اور بعض دوسرے مقامی عمال کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی اپنی قوم کے صدقات جمع کیے تھے بلکہ ہنگامی حالات بالخصوص ردّہ کے پر آشوب زمانے میں بھی اپنے صدقات مدینہ منورہ پہونچاتے رہے تھے اور ان میں سے متعدد حضرات نے خلافتِ صدیقی و فاروقی میں اپنی اطاعت شعارانہ روش برقرار رکھی تھی [۲۱۹]

اوصافِ تقرری

عاملینِ صدقات کی تقرری کے لیے کچھ شرائط کو پورا کرنا اور کچھ اوصاف سے متصف ہونا ضروری تھا۔ سب سے پہلا وصف تو بلاریب انتظامی صلاحیت اور تنظیمی لیاقت تھی کہ اس کے بغیر تمام دوسرے اوصاف بیکار تھے۔ تقرری کے علاقہ یا قبیلہ کے جغرافیائی اور قبائلی حالات سے واقفیت بھی ایک اہم شرط تھی۔ ان کے علاوہ کسی حد تک اس علاقے کے لوگوں سے دوستی، قرابت یا قربت بھی عہدہ پر تقرری کی سفارش کر سکتی تھی۔ مگر ان سب کے علاوہ بلکہ سب سے اہم شرط تھی کہ امیدوار منصب کا کردار بے داغ، اخلاق بلند، تقویٰ و خشیتِ الٰہی سے مالا مال اور حرص و طمع سے آزاد ہو۔

ایک مخصوص شرط یہ تھی کہ امیدوار کا تعلق خاندان بنو ہاشم سے نہ ہو چنانچہ جب حضرات عبد المطلب بن ربیعہ ہاشمی اور فضل بن عباس ہاشمی نے اپنے والدین کی خواہش و ہمت افزائی پر عاملِ صدقات کے عہدہ پر تقرری کی درخواست کی تو وہ مسترد کر دی گئی۔ بنو ہاشم پر یہ قدغن محض اس لیے نہ تھی کہ عاملِ صدقات کو محصول شدہ صدقات سے تنخواہ ملتی تھی جو لوگوں کے اموال کی "گندگی" تھی بلکہ یہ پُرمنفعت یا باتنخواہ عہدہ تھا اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان والوں کو مادی فوائد کے پیچھے بھاگنے سے روکنا چاہتے تھے۔

عہدہ کی طلب کو بھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ "طالبانِ مناصب" کو عہدہ کے لیے ایک طرح سے نااہل قرار دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بار حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ دو شخص خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور انھوں نے مُصَدِّق کے عہدہ پر تقرری کی درخواست کی۔ آپ نے حضرت ابوموسیٰ کی رائے مانگی اور جب انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے ان کی درخواست ان کی "طلب" کی بنا پر مسترد کر دی کہ اس سے عہدہ کے لالچ کی بو آتی تھی۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضرت ابن اللتبیہ ازدی کو بنو سلیم کا عاملِ صدقات مقرر کیا گیا تھا۔ ایک بار جب وہ اپنے صدقات وصول کر کے مدینہ پہونچے تو انھوں نے صدقات کی رقم ادا کرنے کے بعد عرض کیا کہ لوگوں نے ان کو کچھ تحفہ بھی دیا ہے اور انھوں نے وہ تحفہ دکھلایا

بھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ناراضی کا اظہار فرمایا کہ یہ تحفہ ان کو محض اس لیے ملا ہے کہ وہ عاملِ صدقات یا سرکاری افسر تھے اور سرکاری عہدہ دار کے لیے ایسی کوئی چیز لینا جائز نہیں جو اس کو محض اس کے عہدے کے سبب ملی ہو۔ کیونکہ وہ رشوت کے قبیل کی چیز تھی اور اس کی اجازت سے رشوت کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام سرکاری عمال اور افسروں کے لیے اس قسم کے تحفے لینے کی ممانعت فرما دی۔ حافظ ابنِ قیم نے اس مثال سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام عمالِ صدقات اور دوسرے سرکاری افسروں کا باقاعدہ محاسبہ فرمایا کرتے تھے۔[۲۲۲]

عمال کی تنخواہ

عاملینِ صدقات کو جو تنخواہ ملتی تھی اس کے بارے میں ہماری معلومات کسی قدر ناقص ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر کو اس کارِ منصبی کی انجام دہی کے لیے تنخواہ (عمالہ) ملتی تھی۔ اسی طرح قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ عمالِ صدقات کو بالخصوص اور دوسرے افسروں کو بالعموم سرکاری رقوم سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ عاملین کو یہ تنخواہ صدقات کی جمع شدہ رقم میں سے دی جاتی تھی۔ اس کی مقدار کا صحیح صحیح علم تو نہیں ہو سکا تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی کفالت کے لیے مناسب رقم دی جاتی تھی اور اس میں خود عامل، اس کے اہل و عیال، خادم اور مکان کے اخراجات شامل ہوتے تھے اور جو اپنی ضروریات سے زیادہ رقم لیتا تھا وہ غلول کا ارتکاب کرتا تھا۔

ماخذ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمال کی تنخواہ کی ادائیگی کے دو طریقے تھے: ایک تو یہ کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس اپنے دستِ مبارک سے تنخواہ عطا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عمر کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عاملین کو اختیار تھا کہ وہ اپنی ضروریات کی کفالت بھر رقم لے لیں اور اس کا حساب بارگاہِ نبوی میں پیش کر دیں۔ ظاہر ہے کہ آپ جائز ضروریات کے لیے مناسب اخراجات کی توثیق و تصدیق کر دیتے تھے اور زائد از ضروریات یا بے جا صرفہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے تھے جیسا کہ حضرت ابن اللتبیہ ازدی کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔[۲۲۳]

پروانۂ تقرری

تقرری کے وقت عاملینِ صدقات کو دوسرے نبوی افسرانِ حکومت کی مانند دو پروانے ملتے تھے: ایک میں عامل / افسر کے فرائضِ منصبی کا ذکر اور اُن کے سلسلہ میں ہدایاتِ نبوی درج ہوتی تھیں اور دوسرے میں ان کے علاقۂ تقرری کے لوگوں کو مخاطب کر کے ان کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی جاتی تھی۔

عمال کو ہدایت ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کریں، ان پر تنگی نہ کریں۔ ان سے خوش اخلاقی سے ملیں، ان پر ظلم و ستم کرنے سے احتراز کریں۔ لوگوں کے بہترین اموال صدقات میں وصول نہ کریں بلکہ اوسط درجہ پر قناعت کریں، واجب شرح سے زیادہ وصولیابی نہ کریں اور اس سلسلہ میں غیر عادلانہ طریقے نہ اختیار کریں۔ صدقات وصول کرنے کے لیے لوگوں کی چراگاہوں اور گھروں میں خود جایا کریں اور ان کو اپنے پڑاؤ پر آنے کی زحمت نہ دیں۔[۲۲۴]

یہ اور ایسی ہی دوسری ہدایات نے ایمان و یقین اور فرض شناسی کے جوہر کے ساتھ مل کر عوام کے لیے صدقات کی ادائیگی کو ایک خوشگوار و مسرت آگیں کام بنا دیا تھا جس میں تلخی سے زیادہ خوشدلی، بوجھ سے زیادہ راحت، کدورت سے زیادہ مسرت اور گریز و تکدر سے زیادہ تعاون کا احساس شامل تھا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ نبوی عاملینِ صدقات نے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کی ایسی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں کہ ان کی آمد سفیرانِ رسالت اور پیامبرانِ حرم کی آمد کی مانند خوش آئند اور بابرکت سمجھی جاتی تھی۔

کاتبینِ صدقات

مالی نظام میں ایک شعبہ صدقات کے کاتبین پر مشتمل ہوتا تھا جس میں ابنِ حزم کی جوامع السیرہ کے مطابق حکومت کے دوسرے شعبوں کی مانند مختلف مالی محکموں کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جاتا تھا اور متعدد کاتبین یا سکریٹریوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے مطابق حضرت زبیر بن عوام اسدی قریشی اسلامی ریاست کے صدقات کے کاتبِ اعلیٰ تھے کہ وہی سارا حساب

کتاب رکھتے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں حضرات جہیم بن صلت اور حذیفہ بن یمان ازدی صدقات کی آمدنی ان کے رجسٹروں میں لکھا کرتے تھے۔

لیکن قضاعی کی روایت سے کاتبوں کے فرائض کے بارے میں ذرا مختلف اور دوسری معلومات ملتی ہیں۔ اس روایت کے مطابق حضرات زبیر بن عوام اور جہیم بن صلت صدقات کی آمدنی کے کاتب تھے جبکہ حضرت حذیفہ بن یمان ازدی کھجور کی پیداوار کے تخمینے سے متعلق امور کا اندراج کرتے تھے۔

ان روایات کو بیان کرنے کے بعد کتانی کا تبصرہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں (اور بظاہر ان کی صحت میں کوئی اشتباہ وکلام نہیں) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں دیوان (شعبے) عہد نبوی ہی میں قائم ہو چکے تھے۔ قوی امکان ہے کہ بعض دوسرے کاتبین نے بھی مالی نظام کی کتابت و اندراج کا فریضہ انجام دیا ہو۔[۲۲۵]

بہر حال ان تینوں معروف کاتبوں میں سے اول الذکر دو قریش کے دو خاندانوں بنو اسد اور بنو مطلب سے متعلق تھے جبکہ حضرت حذیفہ ازد سے تعلق رکھتے تھے لیکن عملاً وہ مدینہ کے باسی اور ساکنانِ شہرِ نبوی کے حلیف تھے۔ اس لیے تینوں کا تعلق مرکزی عرب بلکہ خاص مدینہ سے تھا اور ایسا ہونا فطری بھی تھا کہ مدینہ مرکزِ رسالت و حکومت تھا۔ البتہ جہاں تک ان کاتبوں کے زمانۂ قبولِ اسلام کا معاملہ ہے تو ان میں سے ایک سابقین اولین میں سے تھے دوسرے ابتدائی مدنی عہد کے اور تیسرے آخری مدنی زمانہ کے۔ گویا تقسیم برابر کی تھی اور سبقتِ اسلام شرطِ تقرری یا حقِ ترجیح نہیں ثابت کرتی تھی۔[۲۲۶]

پیداواری تخمینہ کے افسر

مالی شعبۂ انتظام میں نبوی عمال کا ایک طبقہ خرص (پیداوار کے تخمینہ) کے افسروں پر مشتمل ہوتا تھا جن کو اصطلاح میں "خارص" کہا جاتا تھا۔ عام تصور یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی افسرِ خرص تھے جو آراضی خیبر کی پیداوار کے تخمینہ و اندازہ کے لیے ہر فصل پر وہاں جایا کرتے تھے اور وہ اپنا فرضِ منصبی اپنی وفات (غزوۂ موتہ ۸ھ/۶۲۹ء) تک بڑی شانِ اتقا

اور مثالی انداز میں انجام دیتے رہے تھے۔ بلاشبہ حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجی اپنے حسنِ کردار اور حسنِ عمل کے لحاظ سے ایک مثالی عاملِ صدقات اور خارصِ پیداوار تھے تاہم وہ "یکے از عمالِ دربارِ رسالت" تھے۔ ان کے اس شرف میں کئی اور صحابہ کرام بھی شریک و سہیم تھے۔

روایات کے اختلاف کے مطابق ان کے جانشین حضرت ابوالہیثم بن التیہان اوسی یا حضرت جبار بن صخر بنے تھے۔ دوسری روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ حضرت جبار کے شریکِ کار کی حیثیت سے حضرت زید بن سلمہ خزرجی کی بھی تقرری ہوئی تھی جو پیداوار کے تخمینے کے ماہر تھے۔ ایک اور روایت میں حضرت عمرو بن سعید اموی کو خیبر کے پھلوں کی پیداوار کا خارص بتایا گیا ہے۔ مگر اس سلسلہ کی سب سے زیادہ دل چسپ روایت حضرت ابوحثمہ عامر بن ساعدہ خزرجی کے بارے میں ملتی ہے کہ ان کو عہدِ نبوی میں خیبر کی پیداوار کا افسرِ خرص مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے نہ صرف عہدِ نبوی میں بلکہ پورے عہدِ خلافتِ راشدہ میں اپنا فرض پورے تو لی اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیا تھا کہ حضرت علی کی خلافت کے بالکل اواخر میں اپنے انتقال تک اس عہدہ پر فائز رہے تھے[۲۲۱]۔

دوسرے افسرانِ آراضی

خیبر کی پیداوار کے مذکورہ بالا افسرانِ خرص دراصل اسلامی حکومت کے حصۂ پیداوار یا خُمس کے افسر تھے ورنہ مسلمانوں کی مملوکہ زمینوں کے افسران دوسرے اٹھارہ[۱۸] حضرات تھے جو اٹھارہ[۱۸] سو حصوں کا انتظام دیکھتے بھالتے تھے۔ ان افسروں کو اصطلاح میں رؤوس (رأس کی جمع بمعنی سردار) کہا گیا ہے۔ یہ افسر مدینہ منورہ سے فصلوں کے پکنے کے وقت بھیجے جاتے تھے اور وہ مسلمان مجاہد حصہ داروں کے حصوں کی تخمین کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کے مطابق ان میں بارہ[۱۲] حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ جو یہ تھے: حضرات عاصم بن عدی خزرجی، علی بن ابی طالب ہاشمی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، طلحہ بن عبیداللہ تیمی، معاذ بن جبل خزرجی، اسید بن حضیر اوسی، عبداللہ بن رواحہ خزرجی، فروہ بن عمرو، عمر بن خطاب عدوی، سعد بن عبادہ خزرجی، بریدہ بن حصیب اسلمی اور زبیر بن عوام

اسدی۔ ان میں سے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی نے اوس کا ایک حصہ خرید لیا تھا اس لیے وہ بھی افسرانِ انتظام میں شامل ہو گئے تھے۔ بقیہ چھ اسماءِ گرامی پردۂ خفا میں ہیں[۲۴۵]۔ مذکورہ بالا افراد میں سے چار کا تعلق قریش کے مختلف خاندانوں سے تھا اور اتنے ہی افسر خزرج کے تھے جبکہ تین کا تعلق اوس سے تھا اور ایک بدوی قبیلۂ اسلم کے ممتاز فرد تھے۔ ان میں سے تمام قریشی سابقینِ اولین میں سے تھے، جبکہ مدنی حضرات ابتدائی مدنی عہد کے مسلم تھے اور اسلمی بزرگ کچھ بعد کے مسلمان تھے۔

یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کے انگریزی مترجم مشہور مستشرق الفریڈ گیوم نے اموالِ خیبر کی تقسیم و انتظامِ حصص کے معاملہ کو بالکل نہیں سمجھا ہے اس لیے ترجمہ میں خاصا خلط مبحث کرنے کے علاوہ پورے بیان کو "غیر منظم اور پیچیدہ" بتایا ہے۔

یہ بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے کہ خیبر کے افسرانِ خرص کا اتنا مفصل ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر وادی القریٰ، تیماء، فدک اور دوسرے علاقوں کے بارے میں ہمارے مآخذ عموماً خاموش ہیں حالانکہ یہ یقینی ہے کہ ان علاقوں میں بھی افسرانِ خرص ضرور متعین ہوئے تھے۔ روایات سے خرص کی بعض مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ اول الذکر تینوں یہودی بستیوں نے چونکہ خیبر کی مانند صلح کی شرائط قبول کی تھیں لہٰذا ان کے معاملہ میں افسرانِ خرص کی تقرری ایک حتمی معاملہ ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم ان کے اسماءِ گرامی سے واقف نہیں ہیں۔

دوسرے علاقے: مدینۂ منورہ

اسلامی ریاست کے بعض دوسرے خطوں کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ ان کے لیے علیحدہ افسرانِ خرص کا تقرر کیا گیا تھا۔ اسد الغابہ اور کتانی کے مطابق حضرت فروہ بن عمرو بیاضی خزرجی مدینۂ منورہ کی پیداوار خصوصاً کھجوروں کے باغات کے افسرِ خرص تھے۔ ان کی مہارت و حذاقت کی یہ حالت تھی کہ وہ خوشے گن کر پوری پیداوار کا اندازہ بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دیتے تھے۔ خوشے گن کر پیداوار کا تخمینہ لگانا عرب کاشتکاروں کے لیے ایک عام بات تھی۔ حضرت فروہ کے بارے میں یہ تبصرہ بھی ملتا ہے کہ ان کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا جس

سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ کے مستقل خارص تھے۔ ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سہل بن حثمہ بھی عہدِ نبوی کے ایک افسرِ تخمینہ تھے۔ لیکن ان کے دائرۂ کار اور میدانِ عمل کا علم نہیں ہو سکا۔[۲۲۹]

طائف

محدث ابوداؤد کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عتاب بن اسید اموی مکہ کی گورنری کے ساتھ ساتھ مسلم آراضی کی انگور کی پیداوار کے افسرِ خرص تھے۔ وہ کھجوروں کی پیداوار کے بھی افسرِ خرص تھے اور ایک ہی اصول وضابطہ کے مطابق انگوروں اور کھجوروں کی پیداوار کی زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔ بلاذری کی روایت سے حدیثِ ابی داؤد کی تشریح ہوتی ہے کہ حضرت عتاب اموی طائف کے علاقہ میں واقع کھجوروں اور انگوروں کے باغات کی پیداوار کے صدقات وصول کرتے تھے اور غالباً اس سے مراد مکہ کے متمول افراد کے باغات ہیں کہ حضرات عباس بن عبدالمطلب، خالد بن ولید وغیرہ ــــ متعدد صحابۂ کرام ــــ طائف کے علاقے میں پیداواری جائدادیں رکھتے تھے اور حضرت عتاب بن اسید اموی بطور گورنرِ مکہ ان کے صدقات کی وصولیابی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔[۲۳۰]

یمن

ماخذ میں دو اور خارصوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے نام ہیں حضرات ابوزید بن الصلت اور الصلت بن معدی کرب۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان دونوں کا تعلق جنوبی عرب کے قبیلہ کندہ سے تھا۔ غالباً دونوں اپنے مقامی علاقوں اور قبیلوں میں یہ فریضہ انجام دیتے تھے کہ ماخذ ان کا میدانِ عمل بتانے سے قاصر ہیں۔ اسلامی ریاست کے دوسرے علاقوں خاص کر جنوبی عرب اور شمالی عرب کے بارے میں ہماری معلومات کافی ناقص ہیں لیکن مذکورہ بالا شواہد وحقائق اس خیال کی تائید کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی ریاست کے تمام پیداواری علاقوں کی پیداوار کا خرص کیا جاتا تھا اور اس کے لیے افسرانِ خرص کی تقرری لامحالہ عمل میں آتی تھی۔[۲۳۱]

قبائلی و دینی تجزیہ

مذکورہ بالا دس خارصین جو خیبر کے مسلم حصص کے افسروں کے علاوہ ہیں کے تحلیل و تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غالب اکثریت یعنی ساٹھ فیصد کا تعلق مدینہ کے انصاری قبیلہ خزرج سے تھا۔ اس سے خزرج کے کاشتکار اور ماہر تخمینہ کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ باقی افسروں میں دو کا تعلق قریش سے تھا اور یہ حقیقت بخاری کی اس روایت کی تصدیق کرتی ہے کہ مہاجرین میں سے متعدد حضرات تجارت کے علاوہ زراعت میں بھی لگ گئے تھے۔ دو افسرانِ خرص کا تعلق کندہ سے تھا جو جنوبی عرب کا ایک بڑا قبیلہ تھا اور ایک افسر خرص اوس سے متعلق تھے۔

حضرت عمرو بن سعید اموی کے سوا جو ابتدائی مکی مسلم تھے بقیہ افسرانِ خرص نے آخری مکی زمانے یا ابتدائی مدنی عہد میں اسلام قبول کیا تھا۔ آخر میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے عہدِ نبوی میں افسرانِ خرص کی جتنی حقیقی تعداد تھی اس کا عشر عشیر بھی ماخذ میں مذکور نہیں۔ اصل تعداد یقیناً اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔[۲۳۱]

حمیٰ کے افسر

مالی نظامِ نبوی میں آخری طبقۂ عمال ان افسروں پر مشتمل تھا جو ریاستی چراگاہوں (حمیٰ) کے افسر و منتظم تھے۔ مدینہ منورہ کے علاوہ کئی دوسرے مقامات پر متعدد چراگاہیں مسلمانوں کے مالِ زکوٰۃ کے لیے قائم کی گئی تھیں۔ مدینہ کے قریب ہی الجمع کی چراگاہ تھی جس کے افسر حضرت ابوذر غفاری کے ایک فرزند تھے اور جن کو سنہ ۶ھ / ۶۲۳ء میں مکہ کے ایک سردار کرز بن جابر فہری نے حملہ کر کے شہید کر ڈالا تھا۔ دوسری چراگاہ ذوالجدر نامی تھی جس کے منتظم و افسر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولائے خاص حضرت یسار حبشی تھے اور ان کو سنہ ۶ھ / ۶۲۸ء میں قبیلہ عرینہ کے بعض سرکشوں نے قتل کر دیا تھا۔ الغابہ نامی ایک بہت مشہور چراگاہ تھی جس کے افسر حضرت ابورافع مولائے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

کتانی نے ایک اور افسر حمیٰ کا ذکر کیا ہے مگر ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ ان کے علاوہ ربذہ

اور البیضاء نامی چراگاہیں بھی اسلامی ریاست کی تھیں مگران کے افسروں کا ذکر نہیں مل سکا۔ نقیع نامی چراگاہ جو خاصی وسیع اور شاداب تھی غزوۂ مریسیع کے بعد بنائی گئی تھی اور حضرت بلال بن حارث مزنی کو اس کا افسر مقرر کیا گیا۔ نقیع کے ایک اور افسر کا نام حضرت عبید بن مروّح مزنی بتایا گیا ہے جو غالباً حضرت بلال مزنی کے جانشین یا ساتھی تھے۔

وَج نامی — ایک ریاستی چراگاہ — طائف کے علاقہ میں اس کی فتح کے بعد قائم کی گئی تھی اور اس کا انتظام وانصرام حضرت سعد بن ابی وقاص زہری کے سپرد کیا گیا تھا۔ ایک اور صحابی حضرت عریب المالکی کو بھی ایک چراگاہ کا راعی بتایا گیا ہے جو الغابہ کی چراگاہ سے متعلق تھے۔

مذکورہ بالا سات معروف افسرانِ حمیٰ میں سے دو غفاری، دو مزنی ایک قریشی اور دو مولائے رسول یا حبشی صحابۂ کرام تھے اور ان میں سے مزنی حضرات کے سوا بقیہ سابقینِ اولین میں سے تھے جبکہ بلال مزنی اور ان کے ساتھی وسط مدنی عہد کے مسلمان تھے[۲۲۳]

خلاصۂ بحث

عہدِ نبوی میں مالی نظام کے افسروں کو مقرر کرنے کی نبوی حکمتِ عملی حکومت اور عوام دونوں کی فلاح وبہبود کے نظریہ پر قائم تھی۔ حکومت نہ تو محصول دہندگان کا استحصال چاہتی تھی اور نہ وہ ان کو بے لگام دولت سمیٹنے کے لیے آزاد چھوڑنا چاہتی تھی بلکہ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے وہ مالداروں کی دولت کے ایک حصہ کو وصول کر کے عوام کے غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھی۔[۲۲۴]

اس مقصدِ عالی کے لیے اس نے جن افسروں کا تقرر کیا ان کے لیے بعض کڑی شرطیں اور اہم صفتیں لازمی بنادی تھیں۔ انتظام وانصرام کی ذاتی صلاحیت، تنظیمی قابلیت، خدا ترسی، انسان دوستی، تقویٰ وامانت داری، دیانت وصلابت اور بلند کرداری سب سے اہم اوصاف تھے جو عاملینِ صدقات کے عہدہ پر تقرری کے لیے لازمی تھے۔ ان کے علاوہ قبائلی وجغرافیائی حالات اور مخصوص سیاسی محرکات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جاتی تھی۔

خاندانِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور طالبانِ عہدہ ومناصب پر ان عہدوں کے دروازے بند تھے۔ بنو ہاشم کو غالباً اس لیے محروم قرار دیا گیا تھا کہ وہ مادی فوائد کے پیچھے اپنی دنیا وعاقبت

خراب نہ کریں اور خاندانِ رسالت سے تعلق کے سبب بے جا رعایتوں کے مستحق نہ بن سکیں، ظاہر ہے کہ اموالِ صدقات جن سے عاملوں کو تنخواہ و اجرت ملتی تھی لوگوں کے مال کے دلش (کوڑا کرکٹ) تھے لہٰذا اس سے متعلقینِ رسالت پناہ کو بچانا ضروری تھا۔ طالبانِ مناصب پر یہ دروازہ اس لیے بند کیا گیا تھا کہ لالچ و طمع اور حرص کا سدباب کیا جا سکے۔

ایمان و اسلام اور اللہ و رسول کی محبت اگرچہ لازمی شرط تھی تاہم سبقتِ اسلام عہدہ و منصب پر تقرری کی نہ ضمانت دیتی تھی اور نہ استحقاق پیدا کرتی تھی۔ عہدِ نبوی کے دوسرے انتظامی شعبوں کی مانند اس نظام میں بھی تقرری کی بنیادی شرط صلاحیت و لیاقت اور پاکیزہ اخلاق تھے۔

مذہبی نظام

دین و سیاست

اسلام میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی تفریق جائز نہیں اور ایک مشہور مقولہ کے مطابق دین و مملکت دو توام (ہم زاد) ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی عہد کے صدرِ اول میں سیاسی خدمت عملاً بھی دین ہی شمار ہوتی تھی۔[۲۲۵] یہ دوسری بات ہے کہ بعد کے مسلم حکمرانوں نے اپنے شخصی مفادات، گروہی تعصبات اور غیر مذہبی رجحانات کے سبب دین و سیاست کے درمیان تفریق کی دیوار کھڑی کر کے اسلامی نظریۂ سیاست کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اسے ناقابلِ اصلاح نقصان بھی پہنچایا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ خیر و برکات میں بہر حال دین و سیاست مذہب و حکومت اور اسلام و ریاست باہم اس طرح ایک دوسرے سے وابستہ تھے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دین و ریاست کے اس بے مثال اجتماع میں دین کو تفوق حاصل تھا کہ وہ اصل سرچشمۂ حیات و قوت تھا جبکہ ریاست اس سرچشمہ سے فیض یاب ہونے والی ایک آب جو۔ دین سیاسی قوت کا ضمیمہ یا اس کی پیداوار نہیں تھا بلکہ سیاسی قوت اور ریاستی طاقت دین کو استحکام و مضبوطی عطا کرتی ہے۔ دین اصل تھا اور ریاست اس کا نتیجہ۔ مذہب درخت تھا اور سیاسی قوت اس کے برگ و بار۔

یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صرف مدینۂ منورہ میں ان دونوں کا پاکیزہ اور نادر اجتماع ممکن ہوا تھا جبکہ مکہ مکرمہ میں دین تو موجود تھا، لیکن سیاسی قوت اور ریاست موجود نہ تھی۔ مدینۂ منورہ میں ریاست پر دین کی بالادستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام سیاسی قوت

اور سارے سیاسی اداروں کو دین کی تبلیغ و اشاعت، استحکام اور اس کے اجرا و نفاذ کے لیے استعمال کیا تھا جبکہ اس کے برعکس معاملہ کا کوئی ثبوت ہم کو اسلامی تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتا۔

دینی اور سیاسی نظام کا تعلق

عہدِ رسالت میں اسلامی ریاست اور اس کے جملہ سیاسی ادارے دین کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے وقف تھے، اس لیے تمام سیاسی عہدہ دار و منصب دار بھی اسلامی خدمات کے لیے ہی مقرر ہوتے تھے گرچہ بالواسطہ طور سے سہی گذشتہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے تین مختلف شعبوں — شہری، فوجی اور مالی نظم و نسق — کے افسروں اور کارکنوں نے اسلامی نظام کے لیے کیا خدمات انجام دی تھیں اور ان کی تقرری کن بنیادوں پر کی گئی تھی۔ اس باب میں ہم یہ مطالعہ کریں گے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہبی امور کے شعبہ کی تنظیم کن بنیادوں پر استوار کی تھی اور مختلف مذہبی اداروں میں کارکنوں اور افسروں کا تقرر کیونکر کیا تھا۔ ہمارے اس مطالعہ سے یہ حقیقت اور بھی واضح اور منقح ہو گی کہ مذہبی اداروں نے سیاسی اداروں کی کس طرح تشکیل و تنظیم کی تھی۔

عام نظریات

عام تاثر یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دینی و تبلیغی مساعی پر سیاسی طاقت کے حصول کی کوششوں کو ترجیح حاصل ہو گئی تھی۔ بعض مستشرقین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مدینہ منورہ میں آپ نے دینی لبادہ اتار کر حاکمِ وقت اور سیاسی راہنما کا روپ دھار لیا تھا۔[۲۳] یہ دونوں عمومی اور خصوصی تاثر دراصل اسلام کے نظریۂ سیاست و دین اور ان دونوں کے درمیان باہمی ربط و ارتباط کو نہ سمجھنے کے سبب پیدا ہوئے ہیں۔

دین و سیاست کا امتزاج

دراصل مدینہ میں بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو کار بنیادی طور پر دینِ

اسلام کے داعی، مبلغ اور کارکن ہی تھے البتہ ان کی کارکردگی کی نوعیت بدل گئی تھی یا ان کی تبلیغ و ابلاغ کے ذرائع میں دوسرے عناصر کا اضافہ ہوگیا تھا۔ مدینۂ منورہ میں مواخاۃ و دستورِ مدینہ کے ذریعہ اسلامی معاشرہ و ریاست کی تشکیل و تعمیر کا معاملہ ہو یا فوجی مہمات، فتوحات اور مفتوحہ علاقوں کے شہری نظم ونسق کا ہر ایک کا بنیادی مقصد دین کا قیام اور اسلام کا استحکام تھا اور تمام سیاسی، فوجی اور تنظیمی اقدامات کا محور و مرکز اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا اور کچھ نہ تھا چنانچہ تمام سیاسی ادارے اور ان کے تمام کارکن اسلام کے مبلغ اور دین کے سپاہی تھے جو اپنے اپنے دائروں میں دینی خدمات انجام دیتے تھے۔

تبلیغ و اشاعتِ دین

خالص دینی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کے فریضہ کو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں نے بڑی جاں نثاری اور وفاداری سے انجام دیا تھا۔ یہ ایک معلوم و مبرہن حقیقت ہے کہ مدینۂ منورہ میں اسلام کو روشناس کرانے کا سہرا نبوی ذاتِ اقدس کے سر بندھا ہے۔ چنانچہ ہجرت سے قبل خزرج کے چھ اصحاب کا اسلام قبول کرنا آپ کی اس حکمت عملی کا نتیجہ ہے جس کو ہمارے سوانح نگار عام طور سے قبائلِ عرب کو دعوتِ اسلام کا نام دیتے ہیں[۲۳۷]۔ ان خزرجی مسلمانوں نے مراجعت کے بعد اپنے شہرِ معظم یعنی مدینۂ مبارکہ میں تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا جس کے نتیجہ میں معتدبہ لوگ مسلمان ہوئے اور ان میں سے بارہ[۱۲] نمائندے اگلے برس خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے[۲۳۸]۔ اس بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی مسلمانوں کی درخواست پر ایک نبوی مبلغ مقرر فرمایا اور اس عظیم ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے نگاہِ رسالت نے حضرت مصعب بن عمیر عبدری کا انتخاب کیا۔ حضرت مصعب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندے بھی تھے اور مدینۂ منورہ کے مبلغ، معلم، مقری اور امام بھی کچھ تھے۔ ان کی جاں فشانی سے مدینۂ منورہ کی بیشتر آبادی اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی اور اس تبلیغی کام میں حضرت مصعب کی امداد و معاونت مدینۂ منورہ کے سرکردہ مبلغین و شیوخ بالخصوص حضرات

اسعد بن زرارہ، سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور اسید بن حضیر نے کی۔[۲۳۹]

کبارِ صحابہ اور سابقینِ اولین میں حضرت مصعب بن عمیر عبدری کا انتخاب ظاہر ہے کہ محض ان کی سبقتِ اسلام اور شخصی و خاندانی وجاہت کے سبب نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً سابق صحابی تھے اور انھوں نے اسلام کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں لیکن ان سے کہیں زیادہ سبقت اور قربانی کا شرف رکھنے والے صحابہ موجود تھے۔ ان کا انتخاب محض اس بنا پر کیا گیا تھا کہ وہ مجموعی اعتبار سے اس منصب گرامی کے لیے موزوں ترین تھے۔ وہ پاسدارانِ کعبہ کے خاندان کے ایک متمول خانوادہ عبدالدار کے فرد ہونے کے علاوہ اسلام کے وفادار و جاں نثار، ثابت قدم اور ٹھنڈے مزاج کے شخص تھے جو اسلام کا پیکرِ دلنواز ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ان کی یہی مجموعی صفاتِ حمیدہ تھیں جنھوں نے ایک مختصر عرصہ میں اسلام کے قدم مدینۂ منورہ میں مضبوطی سے جما کر ہجرت کی راہ ہموار کر دی۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی بہ نفسِ نفیس دعوت کے اس کام میں پوری طرح لگے ہوئے تھے اور مختلف قبائل کے مسلمانوں سے بھی تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا بھرپور اور حکیمانہ کام لے رہے تھے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے دورانِ قیام میں مختلف قبائلِ عرب کے نومسلموں کو آپ ان کے اپنے علاقوں اور قبیلوں میں اس ہدایت کے ساتھ واپس بھیج دیتے تھے کہ جب اسلام کو قوت حاصل ہو جائے تو مرکزِ اسلام لوٹ آنا۔ یہ قبائلی نومسلم بلاواسطہ یا بالواسطہ آپ کے مقرر کردہ مبلغ تھے۔ چنانچہ حضرات ابوذر غفاریؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، معتب ثقفی اور متعدد دوسرے صحابۂ کرام نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلام کی اشاعت اسی حیثیت میں کی تھی۔ ان میں سے بعض اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگ تھے جبکہ سارے کے سارے اسلام کے پرجوش سپاہی تھے جو صحبتِ نبوی میں کندن بن گئے تھے اور ان کا اب مقصدِ حیات صرف اسلام کی سربلندی تھی۔[۲۴۰]

ہجرتِ مدینہ کے بعد انفرادی طور سے بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ اسلام کے فریضہ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مدینۂ منورہ میں بچے کھچے عرب کافروں کے قبائل اور علاقوں میں آپ برابر تبلیغ کے لیے جاتے رہے۔ مدینہ کے یہود کو دعوت دیتے رہے اور بہت سے افراد نے آپ کی دعوت پر لبیک بھی کہا۔ مدینہ کی بیشتر آبادی کو مسلمان بنانے میں اگر حضرت مصعب بن عمیر عبدری اور ان کے پرجوش و باعمل اصحاب کا ہاتھ ہے تو اسے مرکزِ اسلام

بنانے میں آپ کی ذاتِ اقدس نے اصل کردار ادا کیا تھا۔[۲۴۱] پھر آپ نے اپنی تبلیغی مساعی کو محض شہرِ محترم کی چار دیواری تک محدود نہیں رکھا بلکہ نواحی قبائل میں بھی تبلیغ وارشاد کا فرض برابر انجام دیا۔

بد قسمتی سے آپ کی ان مساعی کو جن میں تنظیم و اجتماعیت کا ذرا سا بھی عنصر تھا ہمارے مورخین نے غزوات وسرایا کا نام دے دیا اور اس سے بڑی غلطی یہ رہی کہ تبلیغی مساعی اور جنگی مہمات کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی گئی جس کے سبب سے آپ کے تمام غزوات وسرایا کو محض جنگی مہمات اور فوجی اقدامات ہی سمجھا گیا۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر محض تبلیغی دورے اور سیاسی مشن تھے، خاص طور سے بدر سے قبل کے تمام غزوات وسرایا کا مقصد شہر کے ارد گرد کے قبائلِ عرب کو اسلام کے جھنڈے تلے جمع کرنا تھا۔[۲۴۲] بہر حال ان غزوات وسرایا میں بئر معونہ، رجیع اور ذاتِ اطلاح کی مہموں کو مخالفین بھی کلیتاً مذہبی اور تبلیغی مہمات تسلیم کرتے ہیں۔ صلح حدیبیہ، عمرۃ القضا اور حجۃ الوداع بھی غزوات میں شمار ہوتے ہیں حالانکہ ان کی نوعیت سراسر مذہبی تھی۔

اس سلسلہ کی ایک اہم بات یہ ہے کہ سراسر فوجی وجنگی مہمات بھی تبلیغی رنگ سے خالی نہ تھیں۔ ہمارے تمام مآخذ کا یہ متفقہ بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ یا فوجی اقدام سے قبل مخالف فریق کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور اگر کوئی فرد جنگ سے قبل، اس کے دوران یا اس کے بعد اسلام قبول کر لیتا تو وہ اسلامی برادری کا مکمل رکن بن جاتا۔[۲۴۳] یہی نہیں بلکہ آپ اپنے تمام سالاروں کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دیں اور اس کے قبول کر لینے کی صورت میں جنگ سے ہاتھ روک لینے کا حتمی اور لازمی حکم تھا۔ اس حقیقت کا صریح ذکر حضرات عبدالرحمٰن بن عوف، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید وغیرہ کی مہموں کے بیانات میں ملتا ہے۔ تاریخ کی گواہی ہے کہ ان مبلغ سالاروں نے قبیلے کے قبیلے حلقہ بگوشِ اسلام کر لیے تھے۔ چنانچہ دومۃ الجندل کے بنو کلب، ہمدان کے بنو حارث بن کعب، مذحج کے مختلف بطون اور بنو جذیمہ کے اشخاص کا اسلام انھیں سالاروں کا رہونِ منت تھا۔[۲۴۴]

فتحِ مکہ کے بعد تبلیغ واشاعتِ اسلام کے دو ذرائع یا طریقے تھے: ایک وفود کی شکل میں قبائلِ عرب کی خدمتِ نبوی میں حاضری اور دوسرے قبائلِ عرب کے پاس تبلیغی جماعتوں کی روانگی۔ موخر الذکر میں سفیرانِ نبوی، عاملینِ صدقات، ولاۃِ نبوی اور عام عمالِ حکومت سبھی

کارکنانِ حکومت شامل ہیں۔ ان مرکزی عمال کے علاوہ مقامی شیوخ اور کارکنوں کی تبلیغ نے بھی اسلام کی اشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ سفراء، عمال اور ولاۃ کے نام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط و فرامین میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا وہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام ہی کا فریضہ تھا باقی فرائض اس کے ماتحت تھے۔ چنانچہ حضرات معاذ بن جبل، عمرو بن العاص، علاء بن حضرمی، عمرو بن حزم، ابوموسیٰ اشعری اور عباد بن بشر ادی وغیرہ کے نام فرامینِ نبوی اس حکمتِ عملی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

ان حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظامیہ کا ہر رکن دراصل اسلام کا کارکن تھا اور اس کا بنیادی کام اسلام کی اشاعت اور دین کا استحکام تھا۔ اس کے باقی فرائضِ منصبی اس فریضۂ عام کے ماتحت اور ثانوی نوعیت رکھتے تھے۔[۲۲۵]

معلمین

محض اسلام کی تبلیغ سے نہ تو سرزمینِ عرب پر اسلامی ریاست کی توسیع و استحکام کا مقصد حاصل کیا جا سکتا تھا اور نہ اسلام و دین کے قیام و بقا کی ضمانت ہی مل سکتی تھی جب تک کہ اسلام قبول کرنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلامی تعلیمات اور ان کے رگ و ریشے میں جذبۂ ایمانی کوٹ کوٹ کر نہ بھر دیا جاتا۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ ہر طبقہ میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو دین میں تفقہ کا درجہ رکھتی ہو اور جو اپنے غیر فقیہہ اصحاب کو باخبر کر سکے۔[۲۲۶] چنانچہ دین کی تعلیم و تدریس اور اصولِ اسلام کی تفہیم و تشریح دوسرا اہم کارِ نبوی تھا جس کی جانب ذاتِ اقدس نے ابتدا ہی سے پوری توجہ دی۔

اس میدان میں سب سے اہم تو ذاتِ گرامی رسالتمآب ہی تھی جو معلم اول اور مرجعِ اساسی کا درجہ رکھتی تھی۔ تمام اصحابِ کرام اور جملہ مومنین دین کے اصول و فروعات کی تفہیم و تعلیم کے لیے آپ ہی سے رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے فقہاء اور اصحابِ علم تھے جو تعلیم و تدریس کے نقشِ اول کے ہو بہو عکس بن کر ابھرے۔ ورنہ عمومی درجہ میں تو ہر مسلمان جو کچھ جانتا تھا وہ دوسروں کو سکھا دیتا تھا۔

حضرت مصعب بن عمیر عبدری نہ صرف مبلغِ نبوی تھے بلکہ وہ اہلِ مدینہ کے معلم و مقری بھی تھے کہ لوگوں کو قرآنِ حکیم پڑھاتے اور احکامِ دین سکھاتے تھے۔ ان کے دوسرے اصحاب میں حضرت اسعد بن زرارہ بھی تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔[۲۲۷]

ان عمومی معلمین کے علاوہ نومسلموں کے لیے خاص طور سے جہاندیدہ اور تجربہ کار معلمین کا تقرر کیا جاتا تھا۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث ہے کہ حضرت ابن ام مکتوم کو معلمِ قرآنِ کریم مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے حضرت براء بن عازب جیسے متعدد صحابۂ عظام کو قرآنِ حکیم کی تعلیم دی تھی۔ سننِ ابی داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت انصاری اپنے گھر میں اصحابِ صفہ کو قرآنِ حکیم اور فنِ کتابت کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایماء پر دیا کرتے تھے۔ تمام اصحابِ صفہ خود ذاتِ نبوی سے بھی برابر علمی استفادہ کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل نے حضرت انس بن مالک کی سند سے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ اصحابِ صفہ میں سے ستر اشخاص مدینۂ منورہ کے ایک معلم کے گھر پڑھنے جایا کرتے تھے اور وہاں رات بھر تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ اگرچہ اس روایت میں معلمِ گرامی کے نامِ نامی کا ذکرِ خیر نہیں آتا ہے تاہم اس سے مراد حضرت عبادہ بن صامت بھی ہو سکتے ہیں اور کوئی دوسرے صحابی بھی۔[۲۲۸]

اصحابِ صُفّہ

یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ اصحابِ صفہ کے یہ طلبہ انھیں مدنی مراکزِ علم و دانش سے فیض یاب ہو کر ایک دن پھر خود ہی مسندِ تعلیم و ارشاد پر فائز ہوئے۔ کئی روایات میں صراحت آتی ہے کہ تقریباً اسی معلمین و مبلغین جنھوں نے بئر معونہ اور واقعۂ رجیع کے المیوں میں شہادت پائی اسی مدرسۂ علم اور دانش کدۂ نبوی کے فراغت یافتہ تھے۔ حضرت ابوہریرہ دوسی جو کثرتِ روایات میں سب سے زیادہ امتیاز رکھتے ہیں اسی طبقۂ علماء و معلمین کے پروردہ تھے۔ بعد کے زمانہ میں مدرسۂ صفہ کے متعدد فراغت یافتہ معلمین نے اسلامی علم و دانش کی مشعلیں متعدد مقامات میں روشن کیں اور اطرافِ ممالک میں علومِ اسلام کی ترویج و اشاعت خوب خوب کی۔[۲۲۹]

عظیم اساتذہ

اصحابِ صفہ کے علاوہ کچھ ایسے اساتذہ و معلمین کا ذکر روایات میں ملتا ہے جن کے بارے میں خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ ان سے علم حاصل کرنا مہارتِ دینی اور تبحر علمی حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ بخاری کی ایک روایت کے مطابق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کو چار اہلِ علم صحابۂ کرام حضرات عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل سے قرآنِ حکیم سیکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔

نومسلموں کی تعلیم و تربیت کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاص اساتذہ موقع و محل کے لحاظ سے مقرر فرماتے تھے۔ جیسے اصابہ کا بیان ہے کہ ذاتِ نبوی نے بذاتِ خود حضرت وردان کو جو ایک نومسلم تھے دین کی تعلیم کے لیے حضرت ابان بن سعید اموی کے حوالہ کیا تھا۔ کنز العمال کی ایک روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ثعلبہ خشنی کو حضرت ابوعبیدہ بن جراح فہری کے دامنِ تربیت و تعلیم میں یہ کہہ کر دیا تھا کہ "میں نے تم کو ایک ایسے شخص کے حوالہ کیا ہے جو تم کو اچھی تربیت دے گا اور عمدہ ادب سکھائے گا۔" قریش کے بنوامیہ کے خاندانِ سعیدی کے ایک ممتاز فرد حضرت عبداللہ (حکم) بن سعید اموی اسلام لائے تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینۂ منورہ کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے معلم مقرر کر دیا۔

محمد بن حبیب بغدادی نے جُمّاعِ القرآن کے عنوان سے ایک فصل میں چھ صحابۂ کرام کے نام گنائے ہیں جو جامعِ قرآن کے ساتھ ساتھ معلمِ قرآن بھی تھے۔ ان میں حضرات ابی بن کعب اور معاذ بن جبل کے علاوہ حضرات سعد بن عبید اوسی، ابوالدرداء خزرجی، ثابت بن زید خزرجی اور زید بن ثابت خزرجی کے اسماءِ گرامی شامل ہیں۔ ابنِ سعد نے ان میں حضرت قیس بن سکن خزرجی کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے۔[۲۵۱]

ان روایات کے باب میں یہ امر ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ صرف مذکورہ بالا حضرات ہی قرآنِ کریم کے جامع اور حافظ نہیں تھے بلکہ بہت سے اور اصحاب بھی تھے جن

کے اسماءِ گرامی تک ہمارے راویوں کی پہونچ نہیں ہوسکی۔ اس کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ ان روایات میں سے ان اکابر صحابہ کا نام مذکور نہیں ہے جن کے بارے میں خود زبانِ رسالت نے شہادت دی تھی اور جن کو معلمینِ مدینہ مقرر کرنے کی ہدایت دی تھی چنانچہ تمام بزرگ صحابۂ کرام جیسے خلفاء راشدین بشمول حضرت معاویہ، عشرۂ مبشرہ اور متعدد دوسرے اکابر کو تعلیم و ارشاد کا سرچشمہ سمجھنا چاہیے۔

معلمات

اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کا فریضہ صرف مرد صحابۂ کرام ہی نہیں انجام دیتے تھے بلکہ ان کے شانہ بشانہ متعدد صحابیات بھی اپنے تعلیم و تدریس کے حلقے رکھتی تھیں جن سے ریاستِ اسلامی کے مرد و خواتین کے دونوں طبقے فیض یاب ہوتے تھے اور ان میں سے بعض تو معلمینِ اسلام کے اعلیٰ طبقہ میں شامل تھیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ بالخصوص اور دوسری ازواجِ مطہرات بالعموم اسلامی تعلیم و تربیت کا سرچشمہ تھیں اور ان کے مکانات اس کے اولین تدریسی ادارے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ام ورقہ بنتِ عبداللہ بن حارث انصاری حافظۂ قرآن تھیں، اور ان کا فیضِ عام سب کے لیے تھا۔ احادیثِ نبویہ اور مسائلِ اسلامی کی روایت کرنے والی تمام صحابیات اپنے اپنے حلقہ میں تعلیم و تدریس کے فرائض براہِ راست یا بالواسطہ انجام دیتی تھیں[۲۵]

تعلیم قبائل کا مرکزی مدرسہ

مدینۂ منورہ ریاستِ اسلامی کا دل ہونے کے ساتھ ساتھ مرکزِ علم و عرفان اور مدرسۂ تعلیم و ارشاد بھی تھا۔ اس لیے تمام عالمِ عرب کے مسلمانوں کی خواہش و آرزو تھی کہ وہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر سرچشمۂ نبوی سے براہِ راست فیض یاب ہوں۔ تفسیرِ خازن کے مطابق مسلم عرب قبائل کا ایک نمائندہ گروہ مدینہ حاضر ہو کر ایک مختصر مدت میں تفقہ فی الدین حاصل کرتا اور مدرسۂ نبوی سے استفادہ کر کے جب اپنے اپنے علاقوں کو مراجعت کرتا تو اپنے اپنے لوگوں کی تعلیم و تربیت

کی ذمہ داری کا فریضہ انجام دینا۔ اس کی تائید بخاری کی ایک روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت مالک بن حویرث اپنی قوم کے وفد کے ساتھ مدینہ آئے اور بیس دن تک اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہوتے رہے۔ واپسی پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی قوم کا معلم و مربی مقرر فرمایا۔ اسی طرح قبیلۂ عبدالقیس کے نمائندہ حضرت عمرو بن عبد قیس نے جو تعلیم و تربیت جنابِ نبوی میں حاصل کی تھی اس کو اپنے لوگوں میں شائع کیا۔[۲۵۳]

وفودِ عرب

وفودِ عرب تبلیغِ دین کے ساتھ ساتھ تعلیم وارشاد کا فریضہ بھی ادا کرنے پر مامور تھے۔ بیعتِ عربیت اور بیعتِ ہجرت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرق و امتیاز روا رکھا تھا اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اول قسم کی ہجرت کرنے والوں کے لیے مختصر مدتی تعلیمی نصاب [illegible] وہ اس سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنی قوم و علاقہ کے لیے داعی و معلم بنیں اور [illegible] قسم کی بیعت کرنے والے تو مدینہ کے مرکزِ علم و عرفان سے زندگی بھر فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔

قبائلِ عرب کے اساتذہ

وہ لوگ جو کسی سبب سے مدینہ نہیں آسکتے تھے اپنے اپنے قبائلی معلمین سے اسلامی علوم سیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرو بن سلمہ نے اپنے بچپن میں اپنے علاقوں سے گزرنے والے قافلوں سے سن سن کر قرآن سیکھا تھا۔ اسی طرح بنو حنیفہ کے ایک نو مسلم نے اپنے قبیلہ میں دعوت وارشاد اور تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دیا تھا۔[۲۵۵]

مہماتِ نبوی کی تعلیمی خدمات

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی فتوحات اور غزوات و سرایا کے مواقع کو بھی تعلیم و تربیت کے لیے برابر استعمال کیا کرتے تھے چنانچہ ان میں غیر مسلموں کی تبلیغِ دین اور مسلمان ہو جانے والوں کی تعلیم و تربیت کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔

فتحِ مکہ کے بعد نومسلمانانِ مکہ کے لیے آپ نے بطورِ خاص حضرات معاذ بن جبل خزرجی اور ابوموسیٰ اشعری کو معلم و مدرس مقرر کیا تھا اور انھوں نے کافی مدت تک وہاں مسندِ تعلیم وارشاد بچھائے رکھی تھی۔ طائف کے محاصرے کے دوران ثقیف کے جن غلاموں نے دامانِ رسالت میں پناہ لی تھی ان کی تعلیم و تربیت کے لیے جن صحابۂ کرام کا آپ نے انتخاب فرمایا تھا ان میں خاندانِ سعیدی کے تین ممتاز افراد حضرات خالد بن سعید اموی، عمرو بن سعید اموی اور ابان بن سعید اموی کے علاوہ بنو امیہ کے ممتاز ترین صحابی حضرت عثمان بن عفان اور مدینۂ منورہ کے حضرت سعد بن عبادہ خزرجی اور حضرت اسید بن حضیر اوسی شامل تھے[۲۵۵]۔

دانش کدۂ نبوی کے یہ وہ معلمین ہیں جو اپنی فضیلتِ علم اور سعادتِ صحبت کے سبب کافی مشہور اور معروف تھے ورنہ روایات کا اگر استقصا کیا جائے تو ایسے متعدد معلمینِ کرام کا ذکر ملے گا جو اپنے قبیلہ و قوم کو علم و عمل کا درس دیتے اور ان کے ایمان و اسلام کو محکم بناتے تھے۔

عام داعیوں اور معلموں کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر اس پہلو پر بھی توجہ فرمائی تھی کہ مسلمانانِ مدینہ میں بالخصوص اور دوسرے علاقوں میں بالعموم ایسے افراد بھی تیار کیے جائیں جو اسلامی علوم میں گہری بصیرت رکھتے ہوں اور وقتِ ضرورت سجادۂ نبوی کی جانشینی اور مسلمانانِ عالم کی رہبری کے فرائض سے بھی عہدہ برآ ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی آفاقیت بھی اس کا تقاضا کرتی تھی کہ اصحابِ رسول میں ایسے اشخاص بھی ہوں جو کارِ نبوی کو بخوبی اور بہمہ وجوہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس مقصد کے لیے آپ نے اپنے بعض اصحاب کی نہ صرف نظریاتی لحاظ سے تربیت کی بلکہ ان کو باقاعدہ عملی تربیت کے ذریعہ بھی سیادت و امامت کے لائق بنایا تھا۔

حضرت معاذ بن جبل خزرجی کی وہ مشہور حدیث اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے جس کے مطابق صحابی موصوف نے قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی کے بعد اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنے کی بصیرت کا مظاہرہ کر کے بارگاہِ نبوی سے تحسین و تعریف حاصل کی تھی[۲۵۶]۔ صحابیٔ موصوف کی یہ اجتہادی صلاحیت تربیتِ نبوی کی دین تھی اور سیادت و امامت کی تیاری کے مقصد کے لیے نگاہِ خاص سے پیدا ہوئی تھی۔

حضرت معاذ بن جبل خزرجی تنہا اس تربیت و فیضان کے علمبردار نہ تھے بلکہ تمام اکابر صحابہ بالخصوص تمام والیانِ نبوی اور عمالِ حکومت اس صلاحیت سے حصۂ وافر رکھتے تھے کہ وقتِ ضرورت وہ قرآنِ حکیم اور سنتِ نبوی کی روشنی میں نئے مسائل اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں اور عام مسلمانوں کی مذہبی اور دینی قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ و احادیث میں "آثارِ صحابہ" اور "تعاملِ صحابہ" کو سنتِ نبوی کا درجہ دیا گیا ہے، مراسیلِ صحابہ مستند گردانی گئی ہیں اور ان کا ماخذ و منبع ذاتِ نبوی کو قرار دیا گیا ہے کیوں کہ صحابۂ کرام سنتِ نبوی اور قرآنِ کریم سے سرِ موانحراف نہیں کر سکتے تھے۔[۲۵۷]

مفتیانِ گرامی

ہمارے متعدد سیرت و تاریخ نگاروں نے "مفتیانِ نبوی" کے عنوان سے اپنی تصانیف میں خاص فصلیں قائم کی ہیں جن میں ان صحابۂ کرام کا ذکر کیا ہے جو "اصحابِ فتاویٰ" اور "ماہرینِ اجتہاد" تھے۔ ابنِ سعد نے اپنی مختلف روایات میں آٹھ[۸] ایسے صحابۂ کرام کا ذکر کیا ہے جو عہدِ نبوی میں فتوے دیتے اور دینی فیصلے صادر کرتے تھے۔ ان میں چاروں پہلے خلفاء کے علاوہ حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، معاذ بن جبل خزرجی، ابی بن کعب خزرجی اور زید بن ثابت خزرجی شامل تھے۔

ابنِ جوزی نے عہدِ نبوی کے مفتیانِ گرامی کی تعداد تیرہ[۱۳] بتائی ہے اور مذکورہ بالا صحابۂ کرام کے علاوہ حضرات عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن یمان، ابوالدرداء، ابوموسیٰ اشعری اور سلمان فارسی کے اسمائے گرامی کا اضافہ کیا ہے۔

ایک اور ماخذ کے مطابق کم از کم چودہ[۱۴] پندرہ[۱۵] صحابہ فتویٰ دینے کے مجاز تھے۔ ان میں نئے اسماءِ گرامی حضرات عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، انس بن مالک اور حضرت عائشہ صدیقہ کے ہیں جبکہ ایک اور روایت میں مشہور صحابی حضرت عمار بن یاسر کو بھی انھیں اہلِ علم میں شمار کیا گیا ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے عہدِ نبوی کے مفتیانِ عظام کی جو فہرست دی ہے اس میں پچیس[۲۵] صحابۂ کرام کے نام مذکور ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ ان اہلِ فتاویٰ میں سے متعدد حضرات و خواتین

کے فتاویٰ کو کئی ضخیم جلدوں میں مدون کیا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں جن نئے صحابہ کرام کے اسماءِ گرامی آئے ہیں ان میں حضرات عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمرو بن عاص، جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، زبیر بن عوام، عمران بن حصین، ابوبکرہ، عبادہ بن صامت، معاویہ بن ابی سفیان، عبداللہ بن زبیر اور زوجہ مطہرہ ام المومنین حضرت ام سلمہ شامل ہیں۔[۲۵۸]

ایک روایت کے مطابق عہدِ نبوی کے مفتیوں کی تعداد ایک سو بیس[۱۲] سے متجاوز تھی۔

یہ تمام روایات نہ صرف قرینِ قیاس ہیں بلکہ کلی طور سے صحیح و ثابت ہیں۔ البتہ یہ بات واضح کرنے کے لائق ہے کہ ان فہرستوں میں بعض نو عمر صحابہ کرام کے نام بھی شامل ہیں جو عہدِ نبوی میں اس کارِ عظیم کے لائق نہ بنے تھے مثلاً حضرات عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ۔ سوانح نگاروں نے ان بزرگوں کے اسماءِ گرامی کا اضافہ محض اس بنا پر کیا ہے کہ وہ صحابی تھے اور "اپنے زمانے" میں "افتاء" اور "قضا" کے اہل ہی نہیں بلکہ مرجعِ عام تھے۔ اس پہلو سے انھیں دوسرے معاصر صحابہ پر فوقیت حاصل تھی۔

مفتیانِ نبوی کی جو مختلف روایات ہم تک پہونچی ہیں وہ ایک دوسرے کے منافی و متصادم نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مؤید و مصدق ہیں۔ ان میں اسماءِ گرامی کا اختلاف دراصل ان کے راویوں کے اختلافِ علم و معلومات کا نتیجہ ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمام اکابرِ صحابہ کرام جو اہلِ علم تھے اور کافی مدت تک صحبتِ نبوی سے فیض یاب ہوئے تھے افتاء کے اہل تھے اور حقیقتاً فتاویٰ دیتے بھی تھے چنانچہ مختلف ممالکِ اسلامیہ میں صحابہ کرام نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں، ان سے اس امر کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔[۲۵۹]

اماماںِ نماز

نماز اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اس سبب سے اس کے قیام کو اسلام کی نشانی اور کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا گیا ہے۔ نظریاتی لحاظ سے ہر پڑھا لکھا مسلمان امامت کے لائق ہے اور عہدِ نبوی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں امامت صرف آپ کا کلی حق تھا لیکن وقتِ ضرورت دوسرے ائمۂ نماز کا تقرر کیا جاتا تھا۔ مکی دورِ حیات میں

امامت کی زیادہ تر مثالوں کا تعلق آپ ہی کی ذاتِ گرامی سے ہے لیکن مکہ سے باہر بسنے والے مسلمانوں کی اس دینی قیادت کا فریضہ مقامی مسلمان انجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر قبیلۂ عبدالقیس کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے مسجد قباء کے بعد پہلی مسجد قائم کرکے وہاں نمازِ باجماعت ادا کی تھی۔[۲۶۰] ظاہر ہے کہ نماز کی فرضیت کے بعد پنجگانہ نمازوں میں امامت کا معاملہ انھیں خطوط پر طے کیا گیا تھا۔

ائمہ مساجدِ مدینہ

مدینۂ منورہ میں ابتداءً شہرِ مدینہ کے نقیب النقباء حضرت اسعد بن زرارہؓ امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔[۲۶۱] بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر عبدری ان کی جگہ امامِ مدینہ بن گئے کہ ان کی تقرری رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی۔ نقیب النقباء کی حیثیت سے حضرت اسعد بن زرارہؓ کی تقرری بھی منجانب بارگاہِ رسالت تھی۔ حضرت مصعبؓ کی غیر حاضری میں حضرت اسعد ان کی نیابت کرتے تھے۔[۲۶۲] اسد الغابہ کی روایت ہے کہ اسلام کی پہلی باقاعدہ مسجدِ قبا میں حضرت حنظلہؓ بن ابی حنظلہ امامِ نماز تھے۔[۲۶۳] بخاری، ابوداؤد، ابنِ اسحاق اور ابنِ ہشام وغیرہ کی متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے قبل مسلمانانِ مدینہ کے کم از کم دو امام تھے: حضرت مصعبؓ بن عمیر عبدری انصار کی امامت کرتے تھے اور حضرت سالمؓ مولیٰ ابی حذیفہؓ مہاجرین کی۔[۲۶۴]

یہ تقسیم ملت اس معنی میں نہیں لی جانی چاہیے کہ یہ دونوں مسلم طبقے ایک دوسرے سے کلیتاً الگ الگ تھے حتیٰ کہ نمازوں میں بھی ان کا اتحاد و اجتماع ممکن نہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ تقسیم کثرت و قلت کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ مدینۂ منورہ کی ان دونوں مسجدوں کے علاوہ مسجدِ قبا کا امام الگ ہوتا تھا۔ اس طرح شہر اور اس کے نواح میں کم از کم تین مساجد تھیں جن کے تین الگ الگ امام تھے۔

مساجدِ مدینہ

ہجرتِ نبوی کے بعد مسجدِ نبوی کی تعمیر سے قبل اور بعد بھی مدینۂ منورہ کے امام الائمہ رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تھی۔ عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مدینۂ منورہ میں صرف یہی ایک مسجد تھی حالانکہ ابتدا ہی سے شہرِ نبوی میں متعدد مساجد تھیں جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے ان کی شہادت ملتی ہے۔ پھر اسلام کی اشاعت، مسلمانوں کی کثرت اور اسلامی ریاست کے اثر و نفوذ اور توسیع کے ساتھ ساتھ جزیرہ نمائے عرب کے سینے پر مساجد ابھرتی گئیں اور ان میں امام مقرر ہوتے گئے۔

تاریخ و سیر کی روایات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عرب کے تقریباً تمام قبیلوں اور خاندانوں میں ایک سے زیادہ مسجدیں تھیں۔ مسجدوں کی تعداد دراصل آبادی اور جغرافیائی حدود پر مبنی تھی۔ صحیح بخاری کی روایات خود مدینۂ منورہ میں متعدد مساجد کی موجودگی کا پتہ دیتی ہیں جہاں پابندی کے ساتھ نماز قائم کی جاتی تھی۔

مسجدِ نبوی اور مسجدِ قبا کے علاوہ انصار کے دو خاندانوں بنو زُریق اور بنو عمرو بن عوف کی جانب منسوب دوؔ اور مسجدوں کا سراغ ملتا ہے۔ دوؔ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عتبان بن مالک انصاری اپنے خاندان بنی سالم / خزرج کے امام تھے اور اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ نابینا ہونے کے بعد انھوں نے اپنے گھر میں مسجد بنائی تھی۔ انصار کے ایک اور خاندان بنو خطمہ کی ایک مسجد تھی جس کے امام حضرت عبداللہ بن عمیر خطمی تھے۔ حضرت معاذ بن جبل کے بارے میں کتبِ احادیث و سیر میں روایت ملتی ہے کہ وہ اپنی قوم بنو جشم کے امام تھے اور ان کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ابوداؤد کی روایت ہے کہ اوس کے ممتاز خاندان بنو عبدالاشہل کے سردار حضرت اسید بن حضیر اپنی خاندانی مسجد کے امام تھے۔

محدث ابوداؤد ہی نے اپنی کتاب المراسیل میں مدینہ کی کم از کم نوؔ مساجد کا حوالہ دیا ہے۔ یہ تمام مسجدیں مختلف انصاری اور بدوی قبیلوں اور خاندانوں کے نام سے منسوب تھیں جیسے بنو عمرو، بنو ساعدہ، بنو عبید، بنو سلمہ، بنو ریاح، بنو زریق، بنو غفار، بنو اسلم کی مساجد کا ذکر ملتا ہے۔ موخر الذکر کا حوالہ ابنِ سعد میں بھی ہے[۲۶۵]

صحیح بخاری کی شرح عینی میں ایک بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مساجد کے علاوہ شہرِ نبوی اور اس کے نواح میں کم و بیش بائیس[۲۲] اور مساجد تھیں جہاں پابندی سے

با جماعت نمازیں ہوتی تھیں اور ان کے اپنے اپنے امام تھے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔
مسجدِ بنی خُدرہ، مسجدِ بنی امیہ، مسجدِ بنی بیاضہ، مسجدِ بنی حُبلیٰ، مسجدِ بنی عُصَیَّہ، مسجد بنی ابی فیصلہ، مسجد بنی دینار، مسجد ابی بن کعب، مسجد نابغہ، مسجد ابن عدی، مسجدِ بنی الحارث (خزرج)، مسجد بنی خطمہ، مسجد الفضیح، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجدِ وقیم، مسجد بنی معاویہ، مسجدِ عاتکہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل اور مسجد الشجرہ۔[۲۶۶]
یہ تمام مساجد یا تو قبائل اور ان کے خاندانوں کی طرف منسوب ہیں یا مقامات کی طرف۔
ان میں مسجدِ بنی قریظہ کی بڑی تاریخی اہمیت ہے کیونکہ وہ ثابت کرتی ہے کہ عرفات اور برکات احمد کی یہ تحقیق صحیح ہے کہ بنو قریظہ کے بیشتر افراد کو قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف ان کے سرغنوں اور شورہ پشت سرداروں کی سرکوبی کی گئی تھی۔ بہرحال یہ ایک اہم بحث ہے جس پر ہم نے گفتگو دوسری جگہ کی ہے۔[۲۶۷]

علاقائی مساجد

مرکزِ اسلام کے علاوہ جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہاں وہاں مساجد تھیں۔ ذکر آچکا ہے کہ بحرین کے قبیلۂ عبدالقیس کی ایک مسجد تھی جو جواثی نامی گاؤں میں تھی۔ بحرین میں اس کے علاوہ دوسری اور مساجد بھی تھیں کیونکہ جواثی کی مذکورہ بالا مسجد ہجرت سے قبل اور بحرین کے اسلامی مملکت میں شامل ہونے سے پہلے قائم ہوئی تھی۔
خانۂ کعبہ اور مسجدِ حرام مکہ مکرمہ کی اہم ترین مسجد تھی جس کے امام حضرت عتاب بن اسید اموی گورنر شہر تھے۔ اسی طرح ثقیف کے گورنر حضرت عثمان بن ابوالعاص اپنی قوم کی مسجد کے امام تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عموماً گورنر یا والی اپنے علاقہ کی مرکزی مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔
کبھی کبھی امامِ نماز کوئی دوسرا شخص بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ مثلاً جب حضرت عمرو بن عاص سہمی کو عمان کا گورنر مقرر کیا گیا تو حضرت ابوزید انصاری کو ان کے علاقہ کا امام نماز مقرر کیا گیا۔ روایات کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خصوصی انتظام تھا جو خاص وجوہ سے کیا گیا

تھا ورنہ عام طور سے گورنر حضرات ہی یہ مذہبی فریضہ بھی ادا کرتے تھے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو کعب بن اوس کے سردار حضرت شداد بن شمامہ کو اپنی قوم کا امام مقرر کیا گیا تھا۔ واقدی کا بیان ہے کہ کثیر آبادی والے عرب قبائل و بطون نے اپنے اپنے علاقوں میں متعدد مساجد بنالی تھیں جن میں سے بنو جذیمہ اور بنو مصطلق کے بارے میں خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنے میدانوں (ساحاتہم) میں متعدد مسجدیں قائم کر رکھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مسجدیں پورے جزیرہ نمائے عرب میں ہر طرف موجود تھیں اور ان سب کا استقصاء ممکن نہیں۔[۲۶۸]

نائب امام

بعض مخصوص حالات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کوئی دوسرا صحابی بھی امامت کر سکتا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک خاص موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امامت کی تھی اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی امامت میں نماز ادا کی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ اسی موقع یعنی غزوۂ تبوک کے دوران چونکہ مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار سے متجاوز تھی اس لیے اسلامی لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ان کے ایک حصہ کی امامت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور دوسرے کی حضرت ابوبکر صدیقؓ۔

سالار بطور امام

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام سرایا کے دوران سالارِ لشکر امامت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ غزوۂ ذات السلاسل کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح جیسے سابق و گرامی صحابی کی موجودگی میں سالارِ لشکر حضرت عمرو بن عاص سہمی نے امامت کی تھی۔ جو کافی متاخر مسلمان تھے اور یہ تو بہت مشہور واقعہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں حضرت ابوبکر صدیق کو اپنی جگہ امام مسجد نبوی مقرر فرمایا تھا اور اس حیثیت سے صحابئ موصوف نے عہدِ نبوی کی آخری سترہؔ نمازوں کی مسلسل امامت کی تھی۔[۲۶۹]

مؤذنینِ مساجد

نماز کی ایک ابتدائی شرط اذان ہے اور ہجرت کے بعد اذان کے آغاز سے ہی یہ منصب مستقل طور سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن رباح حبشی کو عطا کر دیا تھا۔ مسجدِ نبوی کے ہی وہ مستقل موذن نہ تھے بلکہ وہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر کے موذن تھے۔ چنانچہ تمام غزواتِ نبوی کے دوران یہ فریضہ حضرت بلال حبشی ہی انجام دیتے رہے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین موذن تھے: حضرات بلال حبشیؓ، ابو محذورہ اوس بن معیر جمحی، اور عمرو بن ام مکتوم عامری۔ موخر الذکر رمضان میں اذانِ فجر دیتے تھے جبکہ حضرت بلالؓ اذانِ سحر۔ حضرت ابو محذورہ مکہ مکرمہ میں مسجدِ حرام کے موذن تھے اور تاحیات اس عہدہ پر فائز رہے۔

اسد الغابہ کے مطابق حضرت سعد بن عائذ جو سعد القرظ کے نام سے زیادہ معروف ہیں، مسجدِ قبا کے موذن تھے اسی ماخذ کا بیان ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور موذن حضرت عبدالعزیز بن اصم تھے جنھوں نے ایک دوسری روایت کے مطابق صرف ایک بار اذان دی تھی۔ حضرت عثمان بن عفانؓ منبرِ نبوی کے پاس اذان دیا کرتے تھے۔ جبکہ حضرات زید بن حارث الصدائی اور ثوبان مولائے رسولِ کریمؐ آپ کے موذنوں میں امتیاز رکھتے تھے اسد الغابہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے بنفسِ نفیس حضرت سفیان بن قیس کندی کو اپنی قوم کندہ کا موذن مقرر فرمایا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدوی قبائل کے لیے موذنین کا بھی تقرر کرتے تھے۔ خواہ یہ تقرری براہِ راست ہوتی ہو یا بالواسطہ، بہر صورت وہ عہدِ نبوی کے مذہبی نظام کا ایک حصہ تھا اور اس میں اجازتِ نبوی یا حکمِ نبوی کا دخل ضرور ہوتا تھا۔[۲۶۹]

امراء و عمالِ حج

نماز کے علاوہ زکوٰۃ وغیرہ مالی نظام کے افسران تھے جن پر بحث ہم پہلے کر چکے ہیں ملک کا ایک مذہبی شعبہ جہاں تنظیم اور عمال کی ضرورت پیش آتی ہے وہ حج ہے۔ روایات سے ثابت ہوتا

ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امورِ حج کی باقاعدہ تنظیم کی تھی۔ اگرچہ فتحِ مکہ اور آپ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سال کے عرصہ میں حیاتِ نبوی میں تین مواسمِ حج آئے لیکن آپ نے صرف ایک حج کیا جس کو حجۃ الوداع یا حجۃ الاسلام کہا جاتا ہے اور اس حج کی امارت ظاہر ہے کہ آپ نے بنفس نفیس فرمائی۔

لیکن اس آخری حج نبوی سے قبل دو اور اسلامی حج ہوئے تھے جن کی امارت بالترتیب حضرت عتاب بن اسید اموی گورنرِ مکہ اور حضرت ابوبکر صدیق نائبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی ۸ھ/۶۳۰ء کے اولین اسلامی حج کے بارے میں روایات کا اختلاف ہے کہ آیا اس میں حضرت عتاب اموی کو باقاعدہ امیرِ حج مقرر کیا گیا تھا یا نہیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں روایات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ان کو بارگاہِ رسالت سے باقاعدہ اس منصب پر فائز کر کے بھیجا گیا تھا۔

منادی ومعلن

حجۃ الوداع کے موقع پر کثیر اجتماع کے سبب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پہونچانے کے لیے مختلف منادی مقرر کیے گئے تھے جن میں حضرات ربیعہ بن امیہ اور جریر بن عبداللہ بجلی نمایاں بزرگ تھے بعض دوسرے مواقع پر بھی اسی قسم کے افسر مقرر کیے گئے تھے۔ ان میں حضرت اوس بن حدثان کا ذکر ملتا ہے جن کو ایک مذہبی اعلان کرنے کی خاطر ۹ھ کے حجِ ابی بکر میں روانہ کیا گیا تھا جس طرح حضرت علی کو اسی موقع پر سورۂ برارت کی آیات کے اعلان کے لیے مدینہ سے بطورِ خاص بھیجا گیا تھا۔[۱۲۷]

افسرانِ ہدی

حج کا ایک اہم رکن قربانی ہے اور قربانی کے جانوروں کو اصطلاحاً ہدی کہا جاتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ اور حج دونوں کے لیے مدینۂ منورہ سے ہدی روانہ کرتے تھے اور ان کی نگرانی کے لیے ایک افسر مقرر کرتے تھے جو "صاحب الہدی" کہلاتا تھا۔ روایات کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے مستقل صاحب الہدی حضرت ناجیہ بن جندب اسلمی تھے جو صلح حدیبیہ سے حجۃ الوداع

تک مسلسل کئی مواقع پر یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار حضرت علی کو بھی اس عہدہ سے سرفراز کیا گیا تھا۔ حضرات ذویب بن طلحہ خزاعی، عمرو بن شمالی ہوازنی اور خالد بن سیار غفاری کو بھی مختلف روایات میں صاحب الہدی کہا گیا ہے ممکن ہے کہ بعض دوسرے حضرات نے بھی بعض مواقع پر یہ خدمت انجام دی ہو۔[۲۷۲]

افسرانِ حرم

تنظیم امورِ حج میں ایک اہم کام حدودِ حرم کی تعیین بھی تھی اور اس فرض کی انجام دہی کے لیے آپ نے حضرت تمیم بن اسید خزاعی کو مقرر کیا تھا۔ مکی اشرافیہ کے تمام عہدے اور مناصب اسلامی فتحِ مکہ کے ساتھ ختم ہو گئے تھے سوائے سقایہ اور حجابہ کے اور ان دونوں کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قدیم خاندانوں میں برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ حجاج کی ساقی گری (سقایہ) کا منصب حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی اور حجابہ (تولیتِ کعبہ) کا منصب حضرت عثمان بن طلحہ عبدری کو حسب دستورِ قدیم عطا فرمایا تھا۔ باقی مناصب یا تو ختم کر دئے گئے تھے یا ان کی سربراہی اسلامی ریاست کے سربراہِ اعلیٰ کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔[۲۷۳]

اوصاف و شرائط

مذہبی امور کی تنظیم میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفقہ فی الدین اور علمی مہارت اور تقویٰ کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ چنانچہ حضرت عتابؓ بن اسید اموی اور حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کی تقرری کے ضمن میں ان اسباب و اوصاف کا واضح ذکر ملتا ہے۔ دعوت اور داعیوں کے ضمن میں بھی انھیں عوامل کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن وہاں ان کے ساتھ ساتھ علاقائی نسبت اور جغرافیائی معلومات کو بھی دخل حاصل تھا اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں عوامل دینی تبحر کے ضمن میں ہی شمار ہونے چاہئیں۔

یہ اسباب مجموعی طور سے ہر معاملہ میں کارفرما نہیں ہوتے تھے بلکہ حالات کے تحت ان

کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی تھی اور اسی لحاظ سے ان کو ترجیح حاصل ہوتی تھی۔ بئر معونہ اور واقعۂ رجیع کے مبلغین و معلمین کے معاملہ میں سوائے تفقہ فی الدین اور تقویٰ کے اور کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ ان شہداء سے بھی زیادہ قابل، متقی اور عالم حضرات موجود تھے مگر حالات کے لحاظ سے انھیں کی تقرری بہتر سمجھی گئی۔

یہی صورت حال معلمین کی تقرری میں نظر آتی ہے، خاص کر مکۂ مکرمہ کے معاملہ میں جہاں حضرات معاذ بن جبل خزرجی اور ابو موسیٰ اشعری کو مقرر کیا گیا تھا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر بطور معلم مدینۂ منورہ روانہ کیے گئے تھے اور انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتخاب کو اپنے کارنامے سے حق بجانب ثابت کر دیا تھا حالانکہ وہ نہ سب سے افضل تھے اور نہ سب سے سابق۔

ائمہ اور موذنین کے باب میں تو کسی حد تک اور وہ بھی علاقائی مساجد میں قبائلی نسبت کا لحاظ کیا گیا تھا ورنہ دوسرے تمام مذہبی امور میں تقرری خالصتاً صلاحیت و لیاقت کی بنا پر کی گئی تھی۔

معلمین کے باب میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض نو مسلموں کو ان کے قبولِ اسلام کے فوراً بعد مقرر کیا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کی تعلیمی مہارت اور علمی لیاقت کے سبب یہ تقرری کی گئی تھی جیسا کہ عبداللہ بن سعید اموی کے معاملہ میں معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ اس زمرۂ علماء و عمال میں بنو امیہ کے کئی ممتاز افراد کی تقرری عمل میں آئی تھی جو ان کی انتظامی لیاقت کے علاوہ ان کی دینی بصیرت اور علمی صلاحیت کی بھی آئینہ دار ہے۔

مجموعی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے انتظامی شعبوں کی مانند مذہبی امور کے شعبہ میں بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف صلاحیت و لیاقت کو اصل وجہِ تقرری قرار دیا تھا اور باقی دوسری وجوہ یا تو ثانوی تھیں یا ان کو سرے سے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ یہی سبب ہے کہ نبوی انتظامیہ کو ہر میدان میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور دنیا کے سامنے پہلی بار ایک مثالی ریاست اور اعلیٰ معاشرہ کا قابلِ عمل خاکہ پیش کیا گیا جو اپنی اندرونی خوبیوں اور اعلیٰ صفات کے سبب رہتی دنیا کے لیے مشعلِ راہ، نصب العین اور آئیڈیل بن گیا۔

حواشی

۱؎ اس کی بہترین شہادت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث صحیح سے ملتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی نیت کرتا ہے۔ اگر کسی نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت فی سبیل اللہ ہوگی لیکن اگر کسی نے دنیا حاصل کرنے یا عورت پانے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی دنیاوی مقصد کے لیے ہوگی۔ ملاحظہ ہو۔ بخاری، الجامع الصحیح، باب کیف کان بدءالوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ حقیقت پورے قرآن کریم، احادیث نبوی اور اسلامی تعلیمات میں موجود ہے۔

۲؎ نیت کی خرابی یعنی کسی دنیاوی غرض سے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے ارکان اسلام ادا کیے جائیں تو وہ موجبِ ثواب کی بجائے باعثِ وبال بن جاتے ہیں یہی تمام دوسرے دینی اعمال کا حال ہے ریاکاری سے نماز پڑھنے والے کے لیے عذاب کی وعید ہے (سورہ الماعون ۴-۳) بحالتِ روزہ غیبت کرنے والے کو حدیث کے مطابق فاقہ کے سوا کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ دکھاوے کی زکوٰۃ و صدقہ وبالِ جان بن جاتا ہے اور کسی غیر اسلامی غرض سے حج کی ادائیگی وجہِ عذاب ہے۔

دوسری طرف بظاہر دنیاوی اعمال کا حال یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ثواب، مسکرا کر ملنا صدقہ، بیوی کے منہ میں لقمہ رکھنا باعثِ اجر اور تجارت و زراعت یا ملازمت ایمانداری سے کرنا موجبِ نجات ہے حتیٰ کہ زن و شو کے تعلقات بھی وجہ ثواب و اجر بن جاتے ہیں۔

۳؎ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مجموعہ کا نام اسلام ہے اور ان میں سے جو حق بھی ادا نہ کیا جائے اتنا ہی اس کا اسلام ناقص ہے۔ ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی کی جلدیں ۶-۴

۴؎ ایمانیات اور عبادات کی درجہ بندی کا واضح تصور ان کے بارے میں احکام الٰہی کے نزول سے ہی ملتا ہے اور اس کی تشریح قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی سے۔ اسلام کا اولین مطالبہ توحید ہی کا ہوتا ہے اور اس کے بعد رسالت اور آخرت اور ان کے ضمنی عقائد کا۔ ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی سیرت النبی چہارم

۵؎ ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، ششم۔

۶؎ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی، 'اسلامی ریاست' اور سید سلیمان ندوی، سیرت النبی جلد ہفتم۔

ے۔ شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، سیرت النبی دوم کا باب تاسیسِ حکومتِ الٰہی۔

۸۔ عام طور سے مکی عہدِ نبوی میں اسلامی معاشرہ اور دینی امت کی تشکیل کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا آئندہ مضمون "مکی حیاتِ طیبہ میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل"۔

۹۔ شبلی نعمانی، سیرت النبی اول- ۲۵، کا بیان ہے "کہ قریش کی عظمت و اقتدار اور عالمگیر اثر کا خاتمہ تھا اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی"۔ یہ بحث ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔

۱۰۔ اسلامی ریاست کے مرحلہ وار ارتقار کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب "عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت"، القاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۸ء باب اول۔

۱۱۔ عہدِ نبوی کی اسلامی ریاست کی حدودِ حکمرانی پر نظریاتی بحث ہماری مذکورہ بالا کتاب میں ملاحظہ ہو اور جغرافیائی حدود کی تعیین کے لیے جزیرہ نمائے عرب کا نقشہ۔

۱۲۔ ملک گیر ریاست کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم مسلمانوں کے لیے تو واجب العمل تھا ہی غیر مسلموں کو بھی تمام سیاسی احکام کی پابندی کرنی ہوتی تھی۔ اور وہ صرف انھیں چیزوں میں آزاد تھے جن میں اسلام کوئی پابندی نہیں لگاتا تھا۔ مثلاً غیر مسلموں کو جزیہ وخراج کی ادائیگی کرنے کے علاوہ تمام مقدمات بھی اسلامی اصولوں کے مطابق فیصل کرانے ہوتے تھے اور نجران کے عیسائیوں کو سودی کاروبار کی ممانعت بھی تسلیم کرنی پڑی تھی۔

۱۳۔ قبائلی نظام پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو میری مذکورہ بالا کتاب کا باب اول۔

۱۴۔ قرآنِ مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ اور ان گنت احادیثِ مبارکہ اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ مثلاً :-
سورۂ بقرہ ۱۲۸، ۱۴۱، ۱۴۳، آل عمران ۱۰۴، ۱۱۰، انبیاء ۹۲، المؤمنون ۵۲ وغیرہ۔ مسلم اخوت پر احادیثِ نبوی بھی بہت ہیں۔
عہدِ نبوی میں اس کا عملی اظہار مکی اور مدنی مواخاۃ اور دستورِ مدینہ جیسے اقداماتِ نبوی میں ہوا تھا۔

۱۵۔ مسلمانوں نے مذہبی اور سیاسی ہر لحاظ سے اور غیر مسلموں نے صرف سیاسی لحاظ سے اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کی تھی۔

۱۶۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، باب چہارم۔

۱۷۔ ابن ہشام، دوم ص ۵۹ اور ص ۵۹۸ وغیرہ؛ واقدی، کتاب المغازی، ص ۱۸۱ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ص ۳ وغیرہ؛ طبری، تاریخ، دوم ص ۳۰۷؛ بلاذری، انساب الاشراف اول ص ۲۸ اور ص ۲۸۷-۲۸۸ وغیرہ؛ ابن

خلدون، تاریخ، دوم ص ۴۴۷ ۔

۱۸؎ نائبینِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عام طور سے فقرہ "علی الصلوٰۃ" مآخذ میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے نیابت کو صرف نماز سے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ وہ "نیابتِ کلی" کے ہم معنی تھا۔ اس کے حوالے حاشیہ ۱۷ میں موجود ہیں۔

۱۹؎ مفصل بحث "عہدِ نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت" کے باب چہارم اور اس کے ضمیمہ میں ملاحظہ ہو۔

۲۰؎ ابن ہشام، دوم ص ۵۹-۶۱؛ ابن سعد، دوم ص ۸؛ بلاذری، اول ص ۲۸۷؛ طبری، دوم، ص ۴۰۷؛ ابن خلدون، دوم ص ۴۴۷؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، دوم ص ۲۸۳-۵ اور ص ۲۹۶-۷

۲۱؎ ابن سعد، دوم ص ۹؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۸۷؛ طبری، دوم ص ۴۰۷؛ اسد الغابہ، دوم ص ۲۲۴

۲۲؎ ابن ہشام۔ دوم ص ۵۹۸؛ ابن سعد، دوم ص ۹؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۸۷؛ طبری، سوم ص ۴۰۸ اور اسد الغابہ، پنجم ص ۲۱۸۔

۲۳؎ ابن سعد، دوم ص ۶۳؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۲۲۔

۲۴؎ ابن ہشام، دوم ص ۶۱۲۔ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول ص ۲۸۹ اور ابن خلدون، دوم ص ۴۴۸-۹۔

۲۵؎ واقدی، ص ۱۸۰-۸۱؛ ابن سعد، دوم ص ۱۲ اور ص ۲۹-۳۰؛ طبری، دوم ص ۴۸۱ اور ص ۴۸۵۔ نیز ملاحظہ ہو ابن ہشام، دوم ص ۴۴۵؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۸۹، ص ۳۰۹-۱۰ اور اسد، پنجم ص ۲۸۴-۵۔

۲۶؎ حضرت ابنِ ام مکتوم کی تقرریوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن ہشام، دوم ص ۶۱۲؛ سوم ص ۴۳، ص ۴۶، ص ۱۰۲، ص ۲۲۰، ص ۲۳۴، ص ۲۷۹، ص ۲۸۳ اور ص ۳۹۹؛ واقدی، ص ۱۸۳، ص ۱۹۷، ص ۱۹۹، ص ۳۷۱، ص ۴۴۱، ص ۴۹۶، ص ۵۳۷، ص ۵۳۸، ص ۵۴۷ اور ص ۵۷۳؛ ابن سعد، دوم ص ۳۱، ص ۳۵-۶، ص ۳۹، ص ۴۹، ص ۵۸، ص ۶۶، ص ۷۴، ص ۷۹، ص ۸۰، ص ۹۵، ص ۱۲۵؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۱۰-۱۱، ص ۳۳۹، ص ۳۴۷-۵۰، ص ۴۶۴-۸، طبری، دوم ص ۴۸۳، ص ۵۳۶، ص ۵۵۵؛ نیز اسد، چہارم ص ۱۲۷۔

۲۷؎ ابن ہشام، دوم ص ۴۶ اور ص ۲۰۳؛ واقدی، ص ۱۹۶ اور ص ۴۰۲؛ ابن سعد، دوم ص ۳۵ اور ص ۶۱؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۱۱ اور ص ۳۲۰ اور طبری، دوم ص ۵۵۶۔ نیز ملاحظہ ہو اسد، سوم ص ۳۷۶-۸۴۔

۲۸؎ واقدی ص ۳۸۴؛ ابن سعد، دوم ص ۵۹؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۴۰۔

۲۹؎ ابن ہشام، دوم ص ۲۱۳ اور سوم ص ۶۰۰؛ واقدی، ص ۴۰۴ اور ص ۶۳۶؛ ابن سعد، دوم ص ۶۲ اور ص ۱۰۶؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۴۱ اور ص ۳۵۲؛ اسد الغابہ، دوم ص ۲۵۹۔

۳۰؎ ابن سعد، دوم ص ۱۲۰؛ اسد الغابہ پنجم ص ۲۵۰۔

۳۱ھ ابن ہشام، سوم ص۲-۵۱۹؛ واقدی ص۹۹۵؛ ابن سعد، دوم ص۱۶۵؛ انساب الاشراف، اول ص۳۶۸؛ نیز اسد الغابہ، چہارم ص۳۳ اور ص۴-۱۶ (بالترتیب)

۳۲ھ نابغین نبوی کے زمانۂ قبولِ اسلام کے لیے ابن سعد، اسد الغابہ، اصابہ وغیرہ میں ان کے تراجم کے علاوہ ضمیمۂ کتاب مذکورہ ملاحظہ ہو۔

۳۳ھ تراجم صحابۂ کرام۔

۳۴ھ متعلقہ صحابۂ کرام کے سوانحی خاکے۔

۳۵ھ قرآن کریم، سورہ آل عمران آیت ۱۵۹

۳۶ھ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، خلافت و ملوکیت دہلی ۱۹۶۹ء باب اول۔

۳۷ھ ابن اسحاق، انگریزی ترجمہ الفریڈ گیوم، لندن ۱۹۵۵ء ص۶-۲۳۵؛ بخاری، صحیح، باب الاذان؛ ابوداؤد سنن، باب بدء الاذان؛ انساب الاشراف، اول ص۲۷۳؛ نیز شبلی نعمانی سیرت النبی اوّل ص۲۸۳ حاشیہ ۲

۳۸ھ بخاری، باب المساجد، باب الہجرۃ، باب الحج، کتاب البیوع وغیرہ۔

۳۹ھ ابن اسحاق، ص۲۳۴ وغیرہ۔

۴۰ھ بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۳۲ء ص۲۲؛ زرقانی، شرح علی المواہب اللدنیہ قاہرہ ۱۹۰۷ء دوم ص۸۷۔

۴۱ھ بخاری، باب فضائل الانصار؛ یحییٰ بن آدم، کتاب الخراج، لیڈن ۱۸۹۶ء ص۱۹

۴۲ھ ابن اسحاق، ص۹۹-۴۹۵؛ واقدی، ص۴۲۸، ص۲-۴۳۰ وغیرہ؛ بخاری، باب حدیث الافک؛ مسلم، باب حدیث الافک؛ نیز ملاحظہ ہو قرآن کریم، سورہ نور، آیات کریمہ ۲۰ — ۱۱۔

۴۳ھ بخاری، باب فضائل اصحاب النبی اور فضائل عمرؓ۔

۴۴ھ بخاری، غزوۃ الحدیبیہ اور کتاب الشروط۔

۴۵ھ ابوداؤد، باب المرء والعبد یحذیان من الغنیمۃ۔

۴۶ھ انساب الاشراف، اول ص۳۵۵●

۴۷ھ ایضاً۔

۴۸ھ بخاری، کتاب النکاح، باب موعظۃ الرجل؛ کتاب اللباس، باب ما کان تیجوز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اللباس۔

۴۹ھ ملاحظہ ہو غطفان سے معاہدہ کے سلسلے میں حضرات سعد بن عبادہ و سعد بن معاذ وغیرہ سے متعلق عدد بڑا۔

۵۰؎ ابن اسحاق، ص ۹۳-۲۹۳؛ واقدی ص ۳-۱۰۷؛ بخاری، فضائل اصحاب النبی؛ طبری، دوم، ص ۴۷-۴۴۲، ابن سعد، دوم ص ۷-۶؛ مسلم، غزوہ بدر؛ انساب الاشراف، اول ص ۹۲-۲۹۲۔

۵۱؎ واقدی، ص ۵۳؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۹۳؛ طبری، دوم ص ۴۴۔

۵۲؎ واقدی، ص ۸-۱۰۷؛ طبری، دوم ص ۴۷۔ نیز بدر الموعد کے موقع پر شوریٰ کے لیے ملاحظہ ہو: واقدی، ص ۷-۳۸۶

۵۳؎ واقدی، ص ۱۳-۲۰۹، طبری ص ۲-۳۷۱؛ طبری، دوم ص ۳-۵۰۲؛ انساب الاشراف، اول ص ۵-۳۱۴ نیز ابن اسحاق ص ۲-۳۷۱۔

۵۴؎ واقدی، ص ۱۸۷

۵۵؎ ابن اسحاق، ص ۴۵ وغیرہ؛ واقدی، ص ۵-۴۴۴؛ طبری، دوم ص ۵۶۶

۵۶؎ ابن اسحاق، ص ۵۴۴؛ واقدی، ص ۹-۴۷۷؛ طبری، دوم ص ۵۷۳

۵۷؎ ابن ہشام، دوم ص ۳۱۵؛ واقدی، ص ۶۰؛ ابن سعد، دوم ص ۹۷ طبری، دوم ص ۳۱-۶۳۰

۵۸؎ واقدی، ص ۶۴۳ اور ص ۲-۶۵۱۔

۵۹؎ واقدی، ص ۵۳، ص ۴-۶۴۳، ص ۶-۹۲۵

۶۰؎ واقدی، ص ۷۲۸۔

۶۱؎ واقدی، ص ۸۹۲۔

۶۲؎ واقدی، ص ۹۲۷ اور انساب الاشراف اول ص ۳۶۷۔

۶۳؎ واقدی، ص ۹۳۷ اور طبری سوم ص ۸۴۔

۶۴؎ واقدی، ص ۱۰۱۹۔

۶۵؎ ملاحظہ ہو میری کتاب مذکورہ بالا کا باب چہارم۔

۶۶؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب چہارم اور اس کا ضمیمہ دوم۔۳

۶۷؎ ابن سعد، اول ص ۲۶۷ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص ۶۱۰، ص ۹۶۷ وغیرہ نیز ضمیمہ دوم۔۳

۶۸؎ ابن سعد، اول مذکورہ بالا نیز ضمیمہ دوم۔۳۔

۶۹؎ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب مذکورہ بالا اور ضمیمہ دوم۔۳۔

۷۰؎ ابن سعد، اول ص ۷-۲۶۶، اسد الغابہ چہارم ص ۷-۶۰۶

۷۱؎ ابن سعد اول ص ۹-۲۶۸؛ انساب الاشراف اول ص ۵۳۲؛ اسد الغابہ اول ص ۲-۳۱۱ اور ص ۹-۱۹۶۔

۷۲ه ابن عبدربہ، العقد الفرید، دوم ص۱۴۲ کا بیان ہے کہ حضرت حذیفہ حجاز کی پیداوار کا تخمینہ (خرص) تیار کیا کرتے تھے۔

۷۳ه کتانی اول ص۴-۱۲۳۔

۷۴ه انساب الاشراف اول ص۵۳۲؛ کتانی، اول ص۱۱۸۔ بلاذری نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ اموی کو ایک بار ایک اہم دستاویز لکھوانے کے لیے ان کے گھر سے حضرت عبداللہ بن عباس ہاشمی کے ذریعہ بلا بھیجا۔ حکم نبوی جس وقت ان کے پاس پہونچا وہ کھانا کھا رہے تھے اور کھانا ختم کرکے پہونچنے کا وعدہ کیا۔ اس دوران آپ نے دوبارہ طلب کرلیا مگر ان کا کھانا ختم نہ ہوا تھا۔ آپ نے ان کا پیٹ نہ بھرنے کی دعا دی لیکن ان کا بہرحال انتظار کیا۔

۷۵ه ابن عبدربہ، العقد الفرید دوم ص۱۲۲ اور ص۱۷۴، اسد الغابہ چہارم ص۲۰۳، کتانی، اول ص۱۲۰-۱۔

۷۶ه ابوداؤد، سنن، باب قبول ہدایا المشرکین؛ واقدی، ص۲۴۸، ص۳۲۶، ص۴۴۶، ص۸-۹۴۴، ص۹۴۸، ص۶-۹۷۵، ص۹۸۰، وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو: بخاری، باب القسمہ، مسند احمد بن حنبل دوم ص۳۵۸؛ ابن اسحاق ص۴۴۶، ص۵۱۵، ص۶۷۲ وغیرہ۔

۷۷ه تراجم کاتبین کرام۔

۷۸ه کتانی، اول، ص۲-۱۹۴۔

۷۹ه انساب الاشراف اول ص۲۹۲۔

۸۰ه واقدی، ۶۱۔

۸۱ه واقدی ص۳۶۶؛ ابن سعد، دوم ص۵۷

۸۲ه ابن اسحاق ص۴۵۳؛ ابن ہشام دوم ص۳۰۳، واقدی، ص۹-۴۸۵؛ طبری دوم ص۳-۵۵۲ ابن اسحاق اور ان کی اتباع میں طبری نے تین سفیران گرامی کے ساتھ ایک چوتھے بزرگ حضرت خوات بن جبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن واقدی اس کو صحیح روایت نہیں قرار دیتے۔ حضرت خوات کا تعلق بھی بنو عمرو بن عوف / خزرج سے تھا۔

۸۳ه ابن ہشام، دوم ص۳۱۵، واقدی ص۳-۶۰۰؛ ابن سعد دوم ۷-۹۶؛ طبری دوم، ۲-۶۳۰؛ ابن خلدون دوم ص۸۵۴؛ کتانی اول ص۱۹۵۔

۸۴ه ابن ہشام، سوم ص۶۰؛ نیز ابن اسحاق ص۶۵۴؛ ابن سعد اول ۳-۲۶۲، ۸۵-۲۴۶؛ دوم

ص ۱۲۸؛ اسد الغابہ، چہارم ص ۱۴-۱۳، ۱۲۶ وغیرہ؛

۸۵؎ ابن سعد، اول، ص ۹-۲۵۸، ۲۷۳، دوم ص ۲۶۶ بالترتیب؛ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر ص ۷۵؛ طبری، سوم ص ۱۷۸؛ نیز الاستیعاب، اسد الغابہ اور اصابہ میں تراجم سفرائے گرامی۔

۸۶؎ ابن ہشام، سوم ص ۶۰۷؛ ابن اسحاق ص ۵-۶۵۲؛ ابن سعد، اول ۹-۲۵۸؛ انساب الاشراف، اول ص ۵۲۱؛ طبری، دوم ص ۵-۶۴۴؛ کتاب المحبر ص ۷-۷۵؛ ابن خلدون دوم ص ۹-۷۸۸؛ کتانی اول ۵-۱۹۴۔

سفرائے گرامی کے ساتھ جو فرامینِ نبوی ارسال کیے گئے تھے ان کے متون کے لیے ملاحظہ ہو ابن اسحاق ص ۶۵۳ وغیرہ؛ محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ ص ۵۶-۲۱ وغیرہ۔

۸۷؎ مذکورہ بالا۔

۸۸؎ ابن اسحاق ص ۷-۶۹۰؛ بلاذری، فتوح البلدان، ص ۳۵؛ واقدی، ص ۵۱؛ ابن سعد ص ۷۵، انساب الاشراف، اول ص ۳۴۷؛ طبری، دوم ص ۸۳-۵۸۰۔

۸۹؎ ڈاکٹر برکات احمد اور ڈبلو این عرفات کے دلائل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب مذکورہ بالا کے بابِ اول کی بحث بر بنی قریظہ خاص کر اس کا حاشیہ ۱۵۹ اور ۱۶۰۔

۹۰؎ ابن ہشام، دوم ص ۴۳۰؛ واقدی ص ۸۲۲ اور ۵۵۹؛ ابن خلدون دوم ص ۸۱ اور ۸۳۸۔

۹۱؎ ابن خلدون، دوم ص ۸۱۹؛ اسد الغابہ سوم ص ۶۰-۵۹۔

۹۲؎ واقدی، ص ۱۰۴۶؛ طبری، سوم، ص ۱۱۰؛ ابن خلدون، دوم ۸۲۲؛ اسد الغابہ چہارم ص ۹-۲۷۸، ص ۲۱۴؛ نیز قرآن کریم، سورۂ توبہ ۱۰۷ اور اس کی تفسیر۔

۹۳؎ اسد الغابہ، اول ص ۱۳۳؛ چہارم ص ۷۲، ۵۲؛ اول ص ۱۳۳؛ پنجم ص ۱۰ بالترتیب، اصابہ، سوم ص ۲۳؛ واقدی ص ۱۰۷۶۔

۹۴؎ میری کتاب کا بابِ چہارم اور ضمیمہ دوم۔ ۵ اور اس کے حواشی۔

۹۵؎ ابن اسحاق ص ۵-۱۷۴، ۷-۲۰۶، ۲۲۵، ۷-۳۰۶؛ ۳۲۰؛ ۷-۳۶۵-۳۴، ۴۲۸ وغیرہ، واقدی ص ۲۳، ۲۲، ۸-۱۸۴، ۹۷۶ وغیرہ؛ ابن سعد، اول ۲۹۴؛ دوم ص ۵۷؛ طبری، دوم ص ۹۱-۴۸۹، سوم ص ۱۱۶؛ زرقانی، سوم ۶-۳۷۲۔ اسد الغابہ میں ان شعراء و خطبائے گرامی کے تراجم۔

۹۶؎ بخاری، الجامع الصحیح؛ باب لم یکن لہ بواب؛ کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب العلم وغیرہ کے ابواب؛ مسلم، صحیح، باب النکاح؛ ابو داؤد، سنن؛ باب الامام یصلی من قعود؛ ابن اسحاق، واقدی،

ص ۱۷۸ ؛ انساب الاشراف اوّل ص ۴۷۸، ۴۸۴ ؛ طبری، سوم ۱۷۱ ؛ کتاب المحبر ۲۵۸ ؛ العقد الفرید، سوم ۳۱۶ ؛ کتانی، اول ص ۲۶-۲۱۔

۹۷ ولایات کی تقسیم، نظام اور والیوں کے اختیارات کے لیے میری کتاب مذکورہ بالا کا باب چہارم ملاحظہ ہو۔

۹۸ مصعب زبیری، کتاب نسب قریش ص ۸۴-۱۷۶ ؛ فتوح البلدان ص ۸۴، کتاب المحبر ص ۱۲۶؛ ابن حزم، جمہرۃ نسب قریش ص ۷۳ ؛ اسد الغابہ دوم ص ۳۷۴، چہارم ۸-۱۰۷ ؛ پنجم ص ۳-۱۱۲

۹۹ ابن سعد، دوم ۱۴۵ ؛ اسد الغابہ پنجم ص ۱۵۵ اور ابن ہشام دوم ۴۴۰ ؛ سوم ۵۰۰ ؛ واقدی، ۸۸۹، ۹۵۹ ؛ ابن سعد، دوم ص ۱۳۷ ؛ فتوح البلدان ص ۷۰ ؛ انساب الاشراف، اول ص ۳۰۴ ؛ طبری، سوم ۳۷ اور ۹۴ ؛ اور اسد الغابہ سوم ص ۹-۳۵۸ ، بالترتیب۔

۱۰۰ ابن ہشام، سوم ۵۴۰ ؛ واقدی، ۹۶۸ ؛ ابن سعد اول ۳۱۳ ؛ چہارم ۹-۵۰۸ ؛ پنجم ۵۲۷، فتوح البلدان، ۷۰ ؛ انساب الاشراف اول ۵۲۹، کتاب المحبر، ۱۲۷ ؛ طبری، سوم ۹۹ ؛ اسد الغابہ سوم ۴-۳۷۲؛ پنجم ۵۲۷ ؛ سوم ۳۵۰ ؛ نیز کتانی اول ص ۳-۲۴۱۔

۱۰۱ ابن ہشام، دوم ۶۰۷ ؛ واقدی ۷۸۸ ؛ ابن سعد، دوم ۱۶۱ ؛ انساب الاشراف اول ۳۰-۵۲۹ ؛ طبری سوم ۹۵۔ کتاب المحبر ۱۲۶ ؛ فتوح البلدان ۹۲ ؛ کتانی اول ۲۴۶۔

۱۰۲ ابن ہشام دوم ۶۰۰ ؛ ابن سعد، اول ۳۲۲ ؛ طبری، سوم ۱۴۷ ؛ اسد الغابہ سوم ۴-۳۹۲

۱۰۳ ابن سعد، اول ص ۸۶، ص ۲۷۸ ؛ اسد، دوم ص ۳۹۰ ؛ نیز ضمیمہ دوم — ۸۔

۱۰۴ ابن ہشام، دوم ص ۵۹۰ ، ابن سعد، اول ص ۵-۲۶۴ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۳-۸۰ ؛ طبری، سوم ص ۱۲۱ اور ص ۹-۲۲۸ ۔ اسد الغابہ، چہارم ص ۸-۳۷۶۔

۱۰۵ ابن ہشام، دوم ص ۵۴۳ ، ص ۵۹۰ ؛ ص ۵-۵۹۴ ؛ ابن سعد، اول ص ۲۶۵ ؛ فتوح البلدان، ص ۸۰، اور ص ۸۳-۸۰ ؛ طبری، سوم ص ۱۲۱ ، ص ۱۲۸ ، ص ۱۴۷ ، ص ۳۰-۲۲۸ اور اسد میں ان کے تراجم۔

۱۰۶ طبری، سوم ص ۳۰-۲۲۷ ؛ اسد، اول ص ۱۶۳ اور سوم ص ۶۔

۱۰۷ حضرت علا ابن حضرمی اور بحرین کے صوبہ میں تقرری کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان ص ۹۲-۸۹

۱۰۸ ایک روایت کے مطابق مکہ کے گورنر حضرت عتاب بن اسید اموی کو چالیس اوقیہ چاندی ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، ملاحظہ ہو میری کتاب مذکورہ متن ص ۱۱۶ اور حاشیہ ۲۱۱

۱۰۹ قبائلی اور علاقائی تعلق، زمانۂ قبولِ اسلام اور عمر کے لیے ملاحظہ ہو اسد الغابہ، استیعاب وغیرہ میں ان کے تراجم۔ تاریخ و سیر کی کتابوں میں بھی اس سلسلے کے اکثر و بیشتر حوالے ملتے ہیں۔

۱۱۰ه حاشیہ ۱۰۹ میں جو حوالہ جات ہیں ان میں زمانۂ قبولِ اسلام کی بحث بھی شامل ہے۔

۱۱۱ه ابن ہشام، دوم ص۴۹۱، ص۵۸۳ اور ص۵۹۴ وغیرہ؛ واقدی، ص۵۶۱ اور ص۹۵۵؛ ابن سعد، اول ص۳۱۲، ص۳۲۵، ص۳۲۷، ص۳۴۱-۳۴۰ وغیرہ، طبری، دوم ص۱۳۴-۶؛ سوم ص۹-۸۸، ص۳۰-۱۲۸، ص۶-۱۳۴، ص۱۴۰ وغیرہ اور اسد میں متعدد تراجم۔

۱۱۲ه ملاحظہ ہو ابن ہشام، دوم ص۲۰۴؛ ابن سعد، اول ص۱۳-۱۰۸؛ نیز سوم میں ان کے تراجم، انساب الاشراف اول، ص۲۵۲؛ فتوح البلدان ص۲۰ اور اسد الغابہ میں ان کے تراجم۔

۱۱۳ه ابن سعد، دوم ص۵۰-۳۳۵ اور اسد میں ان کے تراجم۔

۱۱۴ه کتانی، اول ص۵-۲۸۴۔ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، دوم ص۱۲۵

۱۱۵ه اس خیال کے اظہار کے لیے ملاحظہ ہو: ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص۱۰۹ وغیرہ۔ اگرچہ مولانائے گرامی نے سابقین اولین کی سرخیلی کا ذکر خلافتِ راشدہ کے ایک اہم دور کے حوالے سے کیا ہے تاہم اس سے "سبقتِ اسلام" کے فطری حقِ سرداری کا تصور پیدا ہوتا ہے جو عہدِ نبوی پر بھی صادق آتا ہے۔ اگر یہ حق تھا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اس کی کتنی رعایت فرمائی تھی کہ وہی اصل کسوٹی ہے۔ اور یہ تصور صرف مولانا مودودی ہی تک محدود نہیں، متعدد اہلِ علم کا اور بہت مقبول عوامی تصور ہے۔

۱۱۶ه ملاحظہ ہو بحث اسلامی ریاست کا ارتقاء، باب اول میں۔

۱۱۷ه اسلامی معاشرہ اور ریاست کی تشکیل و تعمیر کے لیے مادی قوت بالخصوص فوجی طاقت حاصل کرنے کا حکمِ الٰہی جہاد و قتال کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال: ۶۰ میں خاص طور سے دیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ دشمنانِ دین کے لیے مسلمانوں کو ہر قوت و طاقت جمع کرنی چاہیے خاص کر شہسوار فوج (الخیل) کی طاقت، تاکہ اس کے ذریعہ قرب و جوار اور دور دراز کے دشمنوں کے ساتھ ساتھ معاصر و متاخر تمام اعداء کو خوف و ہیبت میں رکھا جائے۔

۱۱۸ه مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو میری مذکورہ بالا کتاب کا باب سوم اور اس کے حواشی۔

۱۱۹ه ہجرتِ نبوی کے چھ ماہ کے اندر ہی مسجدِ نبوی کی تعمیر، مواخاۃ کی تشکیل، دستورِ مدینہ کی تنفیذ اور ابتدائی مہموں کی شروعات ہوئی۔

۱۲۰ه مذکورہ بالا کتاب کا باب سوم۔

۱۲۱ه آپ کی رسالت کا اقرار ہی آپ کے اقتدارِ اعلیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے مرادف تھا۔ دونوں بیعتوں میں شرکت سے اس اقتدار کو عملی طور سے تسلیم کر لیا گیا۔ اس عمومی فرمانروائی کے حق کو دستورِ مدینہ

کی مذکورہ بالا دفعات نے مزید واضح کر دیا: دفعہ ۲۳ نے تمام اختلافات و مقدمات کو فیصل کرنے کا کلی حق دینے کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو آپ کے فیصلوں کا پابند بھی بنایا، دفعہ ۳۶ نے جنگ و امن کا کلی اختیار اور دفعہ ۴۲ نے مسلموں اور غیر مسلموں کے باہمی اختلافات طے کرنے کا اختیار دیا تھا۔ ملاحظہ ہو: دستورِ مدینہ کتابِ مذکورہ بالا کے بابِ اول میں نیز ابن ہشام اول ص ۴ - ۵۰۱، ابن اسحاق ص ۳-۲۳۱، محمد حمید اللہ، دنیا کا پہلا تحریری دستور، لاہور ۱۹۶۸ء۔

۱۲۲ھ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ ص ۲۳۱، جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک قبائلی سردار یا شیخِ مہاجرین کا درجہ دیا ہے۔

۱۲۳ھ تجزیہ کے لیے کتابِ مذکورہ بالا کی بحث ملاحظہ ہو۔

۱۲۴ھ ابن ہشام دوم ص ۶۰۹ اور ۶۳۲، واقدی، ۵۵۲ اور ۷۷۴؛ ابن سعد، دوم ص ۸۵ اور ۱۳۲؛ انساب الاشراف، اول ۳۷۷ اور ۳۸۱؛ طبری، دوم ۶۴۱ اور سوم ۳۲؛ ابن کثیر چہارم ۱۷۸ اور ۲۷۶ اور اسد الغابہ پنجم ص ۲۴۹۔

۱۲۵ھ ابن ہشام، دوم ص ۶۲۶ اور ص ۶۲۹، ص ۶۲۳، ص ۶۱۸ اور ص ۳۷۳، ص ۳-۶۱۱؛ واقدی ص ۷۷۷، ص ۷۶۹ اور ص ۸۷۰، ص ۵۶۶ اور ص ۵۵، ص ۷۲۳ اور ص ۷۲۷؛ ابن سعد دوم ص ۱۹۴۔

۱۲۶ھ ابن ہشام ص ۲-۶۱۱، ص ۶۴۱، ص ۶۰۹، ص ۶۱۲، ص ۳۷۳ وغیرہ، ص ۴۳۶، ص ۲۲۸، ص ۵۲۶ اور ص ۵۹۲ نیز ص ۶۲۲ اور ص ۶۰۹، واقدی ص ۵۵۲، ص ۶۱۱، ص ۶۴۱ اور ص ۱۸۴، ص ۵۳۴، ص ۵۵۱، ص ۷۵۵، ص ۸۷۰، ص ۸۷۵ اور ص ۱۰۲۵ نیز ص ۷۲۳ و ص ۷۲۶، ص ۷۵ وغیرہ۔ اسی ترتیب کے ساتھ

۱۲۷ھ ابن ہشام، دوم ص ۶۰۹، ص ۶۵۷، ص ۶۱۶، ص ۶۱۲، ص ۶۱۷، ص ۶۳۵، ص ۳۷۳ وغیرہ اسی ترتیب کے ساتھ۔ واقدی ص ۱۹۷، ص ۵۵۳، ص ۵۵۵، ص ۵۶۴، ص ۷۵۵ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو انساب الاشراف، اول ص ۳-۴۷۲۔

۱۲۸ھ ابن اثیر، اسد الغابہ، دوم ص ۷-۲۲۴۔

۱۲۹ھ واقدی ص ۹-۱۱۱۸؛ انساب الاشراف، اول ص ۴۷۴۔

۱۳۰ھ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، سوم ص ۳۱۵؛ شبلی نعمانی، سیرت النبی، اول ص ۷-۱۵۶۔ ازرقی، کتاب اخبار مکہ، ص ۶-۶۴ اور خاکسار کا مضمون "بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت کا تاریخی پس منظر" برہان دہلی ۱۹۸۰ء ص ۲۱-۵۔

۱۳۱ھ واقدی، ص ۷۲۷۔

۱۳۲؎ ابن ہشام، دوم ص ۶۱۱، واقدی ص ۷۲۳۔

۱۳۳؎ طبری، دوم ۱۸۱۴ اور آگے۔

۱۳۴؎ ابن ہشام، دوم ۳۷۳؛ واقدی ۵۵۷؛ ابن سعد، دوم، ۱۲۸؛ انساب الاشراف، اول ۳۸۰؛ طبری، سوم ۳۶؛ ابن کثیر چہارم ۲۱۴؛ اسد الغابہ، اول ۲۸۶؛ دوم ۹۳، ۲۳۴ اور سوم ۱۵۶۔

۱۳۵؎ ابن ہشام، دوم ۴۲۸؛ واقدی ۵-۸۷۵؛ ابن سعد، دوم ۱۴۷ وغیرہ۔

۱۳۶؎ ابن ہشام، دوم ۶-۶۳۵؛ ۹-۶۰۹، ۹-۶۱۸ بالترتیب؛ واقدی ۵-۱۷۲، ۱۸۴، ۵۳۱، ۳۹۱، ۵۶۶ وغیرہ۔

۱۳۷؎ ابن ہشام، دوم ۶۳۳۔

۱۳۸؎ ابن ہشام، دوم ۴۳۶، ۴۸۲ وغیرہ بالترتیب؛ واقدی ۸۷۰، ۵-۸۷۳ وغیرہ بالترتیب۔

۱۳۹؎ ابن ہشام، دوم ۶۴۰؛ واقدی ۵۶۸۔

۱۴۰؎ ابن ہشام، دوم ۶۲۱؛ واقدی ۴۹۷ وغیرہ۔

۱۴۱؎ ابن ہشام، دوم ۶۰۹، ۶۲۱، ۵۲۶، ۵۹۲ اور ۶۴۱ بالترتیب، واقدی، ۳۴۶، ۳۵۴، ۷۵۲، ۱۰۲۵، ۱۰۷۹ وغیرہ

۱۴۲؎ اس تجزیہ کی تفصیلات اور سالارانِ سرایا کی جدولوں کے لیے میری کتابِ مذکورہ کا تیسرا باب۔

۱۴۳؎ ایضاً۔

۱۴۴؎ عددی طاقت کے تجزیہ کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب کا باب سوم۔

۱۴۵؎ ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، ۱۰۹ وغیرہ۔

۱۴۶؎ سالارانِ سرایا کی دینی حیثیت کے لیے کتابِ مذکورہ بالا کا باب سوم نیز ضمیمہ اول - ا ملاحظہ ہو۔

۱۴۷؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب سوم ص ۲۰، ضمیمہ اول - ا نیز اسد الغابہ وغیرہ میں تراجم صحابہ۔

۱۴۸؎ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان صحابہ کرام کی قرابت کے لیے ملاحظہ ہو ابن سعد، اسد الغابہ، اصابہ اور استیعاب میں ان کے تراجم۔

۱۴۹؎ عبد المتعال صعیدی، شباب قریش فی العہد السری للاسلام قاہرہ ۱۹۴۷ء۔

۱۵۰؎ اولین مسلمانوں اور تمام نبوی عمال کے تراجم سے صعیدی کے تجزیہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

۱۵۱؎ واقدی ۶۹۲، ۳۳۷ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۱۰۶، ۱۲۱؛ ابن خلدون مقدمہ ۲-۲۷۱؛ ریوبن لیوی، دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام، ۲۲۸۔

۱۵۲ھ ابن ہشام، اول ص۴۵۷ اور ص۶۱۳، دوم ص۶۵، ص۲۹۸، ص۲۳۴، ص۲۳۸، ص۳۷۷، ص۴۰۶-۷ اور ص۴۵۴؛ واقدی، ص۲۶، ص۵۸، ص۲۱۷، ص۲۱۹، ص۳۳۱، ص۴۲۸، ص۶۰۴، ص۴۶۲-۳، ص۴۶۶، ص۴۹۹، ص۵۰۴، ص۵۴۷، ص۴۴۵، ص۶۸۹، ص۷۴۵-۷، ص۶۰۲، ص۷۳۴-۵، ص۸۰۱، ص۸۱۵، ص۸۱۹، ص۸۲۵، ص۸۹۷، ص۹۱۵، ص۹۲۳، ص۱۰۳۴ اور ص۱۰۹۳

نیز مذکورہ بالا کتاب کا ضمیمہ الف - دوم -

۱۵۳ھ اسد الغابہ میں ان کے تراجم -

۱۵۴ھ واقدی، ۵۵، ۲۰۸، ۲۱۷، ۶-۳۳۴ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۳۷؛ انساب الاشراف، اول ۵-۳۱۴، طبری، دوم ۴۹۴ اور سوم ۱۷؛ اور اسد الغابہ میں مختلف افسرانِ حرس کے تراجم جیسے اول ۳-۹۲ وغیرہ ریویو ان لیوی، مذکورہ بالا، ۴۳۶ -

۱۵۵ھ حوالوں اور تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ مذکورہ بالا کتاب کا باب سوم بحث بر الحرس (محافظ فوج) اور اس کا ضمیمہ اول - ۹ -

۱۵۶ھ مذکورہ بالا حواشی ۵-۱۵۴ - ان جاں نثار انصاری افسران و مجاہدینِ حرس نے غزواتِ بدر، احد حمراء الاسد، ذات الرقاع، حدیبیہ، وادی القریٰ میں متعدد مقامات کے علاوہ زمانۂ امن میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہرِ مدینہ اور امتِ اسلامی کی محافظت کی تھی -

۱۵۷ھ واقدی، ۳۷۱، کے مطابق بنو نضیر کے محاصرہ کے دوران حضرت علی کو جانشین یا محافظِ عسکر بنایا گیا اور دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوبکر کو جبکہ واقدی؛ ۶۴۵ کے مطابق غزوۂ خیبر میں ایک رات حضرت عثمان بن عفان کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی تھی، واقدی، ۴۶۰ کے مطابق حضرت عمر بن خطاب نے غزوۂ خندق کے دوران اس نیابتِ نبوی کا شرف پایا تھا اور واقدی ۶۴۷ کے مطابق غزوۂ خیبر کے دوران بھی۔

۱۵۸ھ غزوات بدر، احد اور خندق کے ضمن میں یہ صراحت ملتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ میں شریک مجاہدین کا معائنہ فرماتے اور جو نوجوان کم عمر یا مجاہدین جہاد کی لیاقت نہ رکھتے ان کو مسترد فرما دیتے تھے حضرت ابن عمر اور ان کے کئی ہم عمر ساتھیوں کو بدر و احد کے مواقع پر رد کر دیا گیا تھا جبکہ حضرت سعد کے کمسن بھائی عمیر زہری کو تیر اندازی میں مہارت کے سبب شرکت کی اجازت مل گئی تھی۔ ملاحظہ ہو: واقدی ۲۱، ۲۱۶؛ ابن سعد، دوم ۱۲؛ طبری، دوم، ۵۰۵ وغیرہ -

۱۵۹ھ واقدی، ۲۶۰؛ ابن سعد، سوم ۵۱۷؛ طبری دوم ۴۳۳؛ اسد الغابہ، چہارم ۲۱۸ -

۱۶۰ھ واقدی، ۶۸۹؛ ابن سعد، دوم ۱۰۷؛ اسد الغابہ دوم ۳-۲۲۱ -

۱۶۱ھ اس کا ایک موٹا سا اندازہ اس حقیقت سے کیا جاسکتا ہے کہ جنگِ بدر میں دو گھوڑوں سے بڑھ کر سات سال بعد ۹ھ/۶۳۱ء کے غزوۂ تبوک میں ان کی تعداد دس ہزار راس ہو گئی تھی۔ ان دونوں نقطوں کے لیے ملاحظہ ہو واقدی ۲۶، ۶۲؛ ابن سعد دوم ۱۲؛ طبری دوم ۴۳۴ اور واقدی ۱۰۰۲؛ ابن سعد، دوم ۱۶۶۔

۱۶۲ھ ضمیمہ کتابِ مذکورہ بالا اول۔۲۔ امرائے خمیس۔

۱۶۳ھ ضمیمہ اول۔۲ بحث برامرائے خمیس۔ حضرت خالد بن ولید مخزومی کی سالاری شہسوار فوج کے لیے ملاحظہ ہو واقدی ۵۷۴؛ ۸۸۹ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۹۵، ۱۰۷، ۱۳۰، ۱۳۵ وغیرہ۔

۱۶۴ھ ضمیمہ اول۔۲ نیز اسد الغابہ، سوم ۱۵۵۔

۱۶۵ھ ماخذ میں دو الفاظ لواء/الویۃ اور رایۃ/رایات پرچم کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ لغوی اعتبار سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں لیکن مورخین نے ان میں اصطلاحی فرق کیا ہے کہ لواء عام قبائلی پرچم ہوتا تھا اور رایۃ خاص نبوی/اسلامی پرچم۔

۱۶۶ھ واقدی، ۱۔۸۰۰؛ اسد الغابہ چہارم ۶۔۲۱۵۔

۱۶۷ھ ابن سعد، دوم ۸۔۶؛ طبری، دوم ۷۔۴۰۲؛ اسد الغابہ میں ان کے تراجم۔

۱۶۸ھ ابن ہشام، دوم ۳۔۶۱۲؛ واقدی، ۸۔۵۶؛ ابن سعد، دوم ۱۴؛ اسد الغابہ، چہارم ۳۷۰۔ حضرت ابوالروم بن عمیر کا ذکر صرف واقدی ۲۳۹ نے کیا ہے۔

۱۶۹ھ حضرت علیؓ کی دس تقرریاں تھیں: غزواتِ بدر، الکدر، حمراء الاسد، بنی نضیر، بدر الموعد، بنی قریظہ، خیبر، فتحِ مکہ، حنین اور طائف۔ تفصیلات ضمیمہ اول۔۲ میں ملاحظہ ہوں۔

۱۷۰ھ واقدی نے حمراء الاسد میں ان کے علمبردار ہونے کا ذکر کیا ہے جبکہ مریسیع کی علمبرداری کا ذکر واقدی، ۳۸۸، کے علاوہ ابن سعد، دوم ۵۹ میں بھی ہے۔

۱۷۱ھ ان تمام پرچم برادرانِ گرامی کے لیے ملاحظہ ہو: ابن ہشام، دوم ص۳۔۶۱۲، دوم ص۶۶، ص۴۳، ص۳۲۸، ص۳۳۴، ص۴۰۷، ص۶۳۱ وغیرہ؛ واقدی، ص۸۔۵۶، ص۲۱۵، ص۲۳۹، ص۳۱۵، ص۳۳۵، ص۳۸۸، ص۴۰۷، ص۴۹۷، ص۶۴۹، ص۷۱۰، ص۸۰۰۔۱، ص۸۲۲، ص۶۔۸۹۵، ص۱۰۰۳ اور ص۱۱۱۵؛ ابن سعد، دوم ص۹۔۶، ص۱۲، ص۲۹، ص۳۱، ص۴۹، ص۹۔۵۸، ص۶۴، ص۶۷، ص۷۴، ص۸۰، ص۱۰۶، ص۱۳۵، ص۱۵۰ اور ص۱۹۰ اور اسد الغابہ میں ان کے تراجم؛ نیز ضمیمہ اول ۳۔

۱۷۲ھ واقدی، ص۲۰۔۱۹، ۵۱؛ ابن سعد، دوم ۱۳۔۱۱؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول ۲۸۸؛

طبری، دوم ۲۲۴، ۴۳۶، اور ۴۷۸۔

۱۷۳ھ واقدی، ۴۱۱؛ انساب، اول ۲۹۴؛ طبری، دوم ۴۵۸۔

۱۷۴ھ واقدی، ۳۲۷ اور اسد الغابہ میں ان کے تراجم۔

۱۷۵ھ واقدی، ۳۷۲؛ اور اسد الغابہ کے تراجم۔

۱۷۶ھ ابن سعد، دوم ۶۱۔

۱۷۷ھ واقدی، ۴۵۸، ۵۳۶، ۵۷۴، ۶۴۰، ۹۲۳، ۱۰۴۱ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۹۵؛ اور اسد میں ان کے تراجم۔

۱۷۸ھ محمد حمید اللہ، عہد نبوی کے میدان جنگ، ۵۳-۷۔

۱۷۹ھ واقدی، ۲۲، ۵۴، ۷-۲۶، ۴۰۴، ۴۱-۶۰؛ ۴۸۹-۹۰، ۵۷۳، ۸۹۴ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۱۲، ۴۷، ۶۳، ۶۹، ۹۵، ۱۵۰ وغیرہ؛ انساب الاشراف اول ۲۸۹؛ طبری، دوم ۴۳۲، ۴۳۷-۸؛ ۵۲۷، ۲-۵۴۱، ۸۱-۵۷۹ وغیرہ؛ اسد الغابہ کے متعلقہ تراجم۔

۱۸۰ھ ابن سعد، سوم ۱۷۲؛ اسد الغابہ، دوم ۷-۲۸۶۔

۱۸۱ھ واقدی، ۲۱۸، ۴۰۳، ۵۸۴؛ ابن سعد، دوم ۳۹، طبری، دوم ۵۰۶ اور تراجم اسد الغابہ۔

۱۸۲ھ واقدی، ۴۱-۶۳۹؛ ۸-۶۴۷؛ ۶۷۴، ۹۹۹؛ ابن سعد، سوم ۲۳ اور تراجم اسد الغابہ۔

۱۸۳ھ ضمیمہ اول-۶ اور بحث باب سوم عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت۔

۱۸۴ھ واقدی، ۱۰۰؛ ابن سعد، دوم ۱۸؛ طبری، دوم ۴۵۸؛ ابن خلدون، دوم ۷۵۵-۔ اور اسد الغابہ کے تراجم۔

۱۸۵ھ واقدی، ۸-۱۷۷؛ ۴۲۷، ۳۷۹؛ ۴۱۰؛ ۱۳-۵۰۹ وغیرہ؛ ابن سعد، دوم ۶۴، ۷۵، طبری، دوم ۴۸۱؛ اور اسد الغابہ کے تراجم۔

۱۸۶ھ واقدی ۵۱۳، ۶۸۰؛ ابن سعد دوم ۱۰۷ اور اسد الغابہ کے تراجم۔

۱۸۷ھ واقدی ۹۴۳، ۹۴۹، ۹۵۳؛ اور ۹۸۳؛ ابن سعد، دوم ۱۶۴ اور اسد الغابہ کے تراجم۔

۱۸۸ھ بحث باب سوم عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت اور ضمیمہ اول-۷۔

۱۸۹ھ واقدی، ۵-۷۳۳؛ ابن سعد، دوم ۱۲۱؛ طبری، سوم ۲۶؛ اور تراجم اسد الغابہ۔ ضمیمہ اول-۸

۱۹۰ھ میری کتاب کا باب سوم بحث "محافظ دستوں کے افسر" اور اس سے متعلق ضمیمہ اول-۹۔

۱۹۱ھ مولانا محمد تقی امینی، اسلام کا زرعی نظام؛ سید ابوالاعلیٰ مودودی، معاشیات اسلام، سود وغیرہ؛ نور محمد غفاری، نبی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی وغیرہ چند اہم مثالیں ہیں۔

۱۹۲ه سیرت النبی، دوم ص ۷۷-۲۳؛ محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ اردو ترجمہ ص ۹-۵۸۷؛ کے علاوہ خاکسار نے بعض اہم مباحث سے تعرض کیا ہے جن میں معیشتِ نبوی، غزوات و سرایا کی اقتصادی اہمیت، مدنی مسلم معیشت میں اموالِ غنیمت کا حصہ، وغیرہ مقالے اور کتابچے شامل ہیں۔

۱۹۳ه سوم ص۲۲-۱۲۳؛ واحدی، اسباب النزول، قاہرہ (غیر مورخہ) ص۹۰-۱۸۹۔ نیز ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، جلد پنجم ص۱۵۴ جو اس مسئلہ میں یوں رقم طراز ہیں کہ "بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے پریشانی ہوئی۔ حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ خیرات کا مترادف تھا۔ اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہونچیں"۔

۱۹۴ه ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، قسم دوم ص۵۵۰ اور ص۶۰۰، طبری، تاریخ، جلد سوم ص۲-۱۲۳۔

۱۹۵ه ابن ہشام، ص۶۳۲؛ واقدی ص۲-۵۹۰، ابن سعد، جلد دوم ص۸۹، بلاذری، اول ص۳۷۸؛ طبری، تاریخ، دوم ص۶۳۲؛ ابن اثیر، اسد الغابہ، جلد سوم ص۱۷-۳۱۳۔ خیبر وغیرہ کے خراج کے لیے ملاحظہ کیجیے: ابن اسحاق، سیرت رسول اللہ انگریزی ترجمہ ص۱۸-۵۱۰، ص۵۲۳، ص۵۱۶، واقدی ص۹۳-۶۳۳، ص۷۰-۶۹۰، ص۱۱-۷۰۹؛ ابن سعد، دوم ص۱۰۱-۱۰۶، ص۴۲-۳۶، ص۵-۱۱۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول ص۳۵۲؛ فتوح البلدان، مرتبہ محمد رضوان ص۴۸-۴۲؛ نیز شبلی نعمانی، سیرت النبی اول ص۵۰۲-۴۸۰۔

۱۹۶ه ملاحظہ ہو: باب اول میں بحث بر ولاۃ (گورنر) ولایات اور ان کے فرائض۔

۱۹۷ه یحییٰ ابن آدم، کتاب الخراج؛ طبری سوم ۶۵

۱۹۸ه واقدی، ص۸۱-۹۸۰؛ ابن سعد، دوم ص۱۶۱: اسد الغابہ، پنجم ص۹۱-۹۰

۱۹۹ه طبری، دوم ص۶۴۲، سوم ص۹۵۔

۲۰۰ه یہ پوری بحث ہماری مذکورہ بالا کتاب سے ماخوذ ہے۔

۲۰۱ه ان مرکزی عاملینِ صدقات اور ان کے علاوہ تقرری کے لیے ملاحظہ ہو: واقدی، ۶۰-۵۹، ۹۷۳-۹۴، ۹۸۰-۱؛ ابن سعد اول ۸-۲۷۰، ص۳۰۰؛ دوم ص۶۲-۱۶۰، پنجم ص۵-۴۴؛ ہفتم ص۴۰۳؛ بلاذری، انساب الاشراف، اول ص۳۱-۵۲۹؛ طبری، تاریخ، سوم ص۲، ص۵۹، ص۹۵، ص۱۴۷، ص۱۴۸، ص۹۰-۳۸۹۔ ابنِ عساکر، تاریخ دمشق، اول ص۴۵۳؛ زرقانی، سوم ص۹-۳۶۸؛ ابن خلدون، تاریخ دوم ص۸۳۵؛ کتانی، اول ص۳۱؛ اسد الغابہ، چہارم، ص۲۵۰، ص۴۰۶، ص۷-۳۸۵،

اصابہ، چہارم ص۲۵۸؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ؛ اول ص۶۱-۵۹۔

۲۰۲ء ابن اسحاق، ص۶۹۳؛ واقدی ص۹۸۱-۹۸۰؛ ابن سعد، دوم ص۱۶۱، اسد الغابہ، پنجم ص۹۱-۹۰؛ ابن خلدون، دوم ص۸۳-۸۲؛ نیز میرا مضمون "تاریخ اسلام میں فن شان نزول کی اہمیت۔ ایک تنقیدی نظر" مجلہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ جلد ۱، شمارہ ۲-۱۔

۲۰۳ء طبری، دوم ص۵۸۸، سوم ص۱۵۴ اور ص۱۶۸؛ فتوح البلدان ص۱۸۶-۱۸۵؛ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ دوم ص۲۰۵ نیز میری زیر طبع کتاب "حضرت ولید بن عقبہ اموی۔ حیات و شخصیت"

۲۰۴ء واقدی، ص۹۷۳ اور ابن سعد، دوم ص۱۶۰۔

۲۰۵ء طبری، سوم ص۳۸۹-۹؛ ابن عساکر، تاریخ مدینہ دمشق اول ص۴۵۳؛ ابن خلدون دوم ص۹۸-۹۸۔

۲۰۶ء بحوالہ کتانی، اول ص۲۶۵ اور ص۳۹۶ نیز ملاحظہ ہو اسد الغابہ، چہارم ص۵۳-۵۲؛ ابوداؤد، سنن، ارزاق العمال۔

۲۰۷ء اسد الغابہ، چہارم ص۶-۴، ص۲۵ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد، ہفتم ص۴۰۳، اسد، چہارم ص۵؛ اصابہ، چہارم ص۲۵؛ انساب الاشراف، اول ص۵۳۱

۲۰۸ء واقدی، ص۹۲۱-۲، ص۹۷۳؛ ابن سعد، اول ص۲۹۳ دوم ص۱۶۰، اسد الغابہ اول ص۱۸۱-۲؛ چہارم ص۳۸۵-۷؛ ابن خلدون، دوم ص۸۳۵۔

۲۰۹ء عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت کا باب پنجم ضمیمہ سوم ۲ اور حواشی۔

۲۱۰ء میری کتاب مذکورہ بالا کا تجزیہ ملاحظہ ہو۔

۲۱۱ء ایضاً۔ حافظ ابن قیم کے تبصرہ کا ذکر کتانی اول ۲۳۷ نے کیا ہے۔

۲۱۲ء مقامی عمال صدقات اور قبائلی سرداروں کے لیے ملاحظہ ہو میری مذکورہ بالا کتاب کے متعلقہ ضمیمے۔

۲۱۳ء مثلاً کلب (دومۃ الجندل) کے سردار حضرت امرؤالقیس ابن الاصبغ، حضرت مالک بن عوف نصری شیخ ہوازن وغیرہ متعدد حضرات کو آپ نے ان کے سابقہ عہدوں پر برقرار رکھا ملاحظہ ہو ابن ہشام دوم ص۴۹۱، واقدی ۱۵۴۱، ۹۵۵؛ ابن سعد اول ۳۱۲؛ طبری، سوم ۹-۸۸ وغیرہ۔ مگر حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی کو آپ نے از خود مقرر فرمایا۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام سوم ۵۴۰؛ واقدی ۹۶۸، ابن سعد اول ۳۱۲؛ طبری، سوم ۹۹ وغیرہ۔

۲۱۴ء ابن سعد، دوم ۱۶۰؛ اسد الغابہ اول ص۱۲۶-۱۲۵؛ واقدی ۲-۹۲۱۔

۲۱۵ء ابن اسحاق ۶۹۳؛ واقدی ۱-۹۸۰؛ ابن سعد دوم ص۱۶۱؛ اسد الغابہ پنجم ۹۱-۹۰۔

۲۱۶؎ واقدی، ۵۶۱؛ اسد الغابہ ۹۹؛ مجموعۃ الوثائق، ۷-۱۶۸۔

۲۱۷؎ واقدی ۵۶۱؛ ۹۷۳؛ وغیرہ؛ مجموعۃ الوثائق، ۸-۵۶؛ ۲-۶۱-۸؛ ۷-۶۷؛ ابن سعد، اول ۳-۱۶۲؛ اسد الغابہ میں ان کے تراجم۔

۲۱۸؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، باب پنجم، ضمیمے اور حواشی۔

۲۱۹؎ ابن ہشام، دوم ۶۰۰، ابن سعد، اول ۲۷۰، ۳۲۲؛ طبری، سوم ۱۴۷؛ اسد الغابہ اول، ۲۰۶، ۵-۲۴۴؛ دوم ۱۱۶، ۵-۱۹۴؛ ۷۰-۳۶۹؛ ۳۸۴؛ سوم ۸-۲۷، ۱۲۵، ۴-۳۹۲؛ چہارم، ۲۹۵؛ پنجم ۷۵، ۹۹، ۱۶۷؛ ۲۰۵، وغیرہ؛ کتانی، اول ۸-۳۹۶۔

۲۲۰؎ میری کتاب کا مذکورہ بالا باب۔

۲۲۱؎ مسلم، صحیح، کتاب الصدقات؛ بخاری، کتاب الصدقات؛ واقدی ۷-۲۹۶؛ کتانی، اول ص ۲۳۷۔

۲۲۲؎ مسلم، صحیح، کتاب الصدقات۔

۲۲۳؎ بخاری، باب رزق الحکام والعاملین علیہا؛ ابوداؤد، سنن، ارزاق العمال؛ مصنف عبدالرزاق بحوالہ کتانی، ص ۶-۲۶۴؛ واقدی، ص ۳-۹۹۱، ابن سعد، طبقات، پنجم ص ۹-۵۲۴، نیز نقوش رسول نمبر پنجم ص ۸-۶۷۹

۲۲۴؎ ابن اسحاق ص ۶۴۴، واقدی ص ۹۷۴؛ ابن سعد، اول ص ۲۷؛ دوم ص ۱۶۰؛ نسائی، سنن ص ۳۹ بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم ص ۷۵، مجموعۃ الوثائق ص ۱۵۷، ص ۱۶۵، کتانی، اول ص ۳۹۲۔

عمال صدقات کی کارکردگی، حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل کے بارے میں ایک صحابی حضرت سُوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عامل آیا اور اس نے پہلے تو ان مویشیوں کی اقسام بتائیں جن کے صدقہ میں لینے کی اجازت فرمان نبوی میں نہ تھی، حسن اتفاق سے اسی وقت ایک محصول دہندہ ایک عمدہ قسم کی اونٹنی صدقہ میں دینے کے لیے لایا لیکن عامل نے اس کو لینے سے انکار کر دیا کہ وہ بہت عمدہ نسل کی تھی۔ دوسری روایت ہے کہ دو عامل صدقات جب ایک مسلمان مویشی پالنے والے کے پاس پہونچے اور اس سے صدقہ طلب کیا تو مسلمان نے بربنائے اخلاص و محبت بہت عمدہ دودھاری بکری پیش کی جسے ان محصلین نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اس کے لینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس قسم کے متعدد واقعات روایات میں ملتے ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو نقوش، رسول نمبر، جلد پنجم ص ۳-۶۷۲

۲۲۵؎ ابن حزم، جوامع السیرۃ اور قضاعی کی روایت بحوالہ کتانی، اول ۹-۳۹۸۔

۲۲۶؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، باب پنجم۔

۲۲۷؎ ابن اسحاق، ص ۴-۵۲۳، واقدی ص ۶۹۱، طبری، سوم ص ۲۱-۲۰؛ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج

ص ۲۹ اور ص ۵۱ نیز ملاحظہ ہو: ابن ہشام، دوم ص ۳۶۴؛ ابن خلدون، دوم ص ۴۹۶؛ اسد الغابہ، اول ص ۲۶۵؛ دوم ص ۲۳۲؛ چہارم ص ۸-۱۰۷؛ ص ۹-۱۷۸؛ پنجم ص ۱۶۹؛ کتانی، اول ص ۱-۴۰۰؛ نقوش رسول نمبر جلد پنجم ص ۴۸۸۔

۲۲۸ء ابن اسحاق، ص ۲۰-۵۲۱؛ واقدی ص ۹۱-۹۸۹؛ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص ۲۹، ص ۵۱، نیز مترجم کا حاشیہ ص ۵۲۲ حاشیہ ۱؛ اسد الغابہ میں صحابۂ کرام مذکورہ بالا کے تراجم؛ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو نقوش رسول نمبر پنجم ص ۸-۶۵۷، اور ص ۶۱-۶۵۹۔ خرص کی دوسری مثال کے لیے ملاحظہ ہو: واقدی ص ۹۸۹ اور صحیح مسلم، باب غزوۂ تبوک۔

۲۲۹ء اسد الغابہ، چہارم ص ۹-۱۷۹؛ پنجم ص ۱۶۹؛ کتانی، اول ص ۱-۴۰۰؛ نیز ملاحظہ ہو، واقدی، ص ۹۸-۹؛ امام مسلم، الجامع الصحیح، باب غزوہ تبوک۔

۲۳۰ء ابو داؤد، سنن، بحوالہ کتانی اول ۴۰۰؛ انساب الاشراف چہارم ۱۵۰۔

۲۳۱ء اسد الغابہ، پنجم ص ۲۰۵؛ کتانی، اول ص ۴۰۰

۲۳۲ء اسد الغابہ میں صحابہ کرام کے تراجم ملاحظہ ہوں۔ نقوش رسول نمبر پنجم ص ۶۸۹؛ دوازدہم ص ۲۶۸ نیز ضمیمہ سوم ۳ (ص ۴۶)۔

۲۳۳ء ابن اسحاق ص ۲۸۶، ص ۴۸۶ حاشیہ ۱؛ واقدی، ص ۱۲، ص ۶-۲۵۴، ص ۶-۵۳۸، ص ۷-۵۹۹، ص ۹۷۳؛ ابن سعد، دوم ص ۹، ص ۶۷، ص ۸۱-۸۰؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۸۷، ص ۳۳۸، ص ۸-۴۸۰، اسد الغابہ، سوم ص ۳۵۳؛ یاقوت حموی، معجم البلدان، بیروت پنجم ص ۳۶۱ (ب) مجموعۃ الوثائق ص ۱۵۹؛ نقوش، رسول نمبر پنجم ص ۹۳-۶۹۰؛ دوازدہم ص ۲۷؛ ضمیمہ سوم ۴ نیز ص ۹-۲۶۸۔

۲۳۴ء ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء ان الصدقۃ توخذ من اغنیائہم الخ

۲۳۵ء اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۸۰-۹۳؛ محمد یٰسین مظہر صدیقی، عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، باب اول، اسلامی ریاست منہاج و مقصد اور تاریخی و نظریاتی پس منظر، نیز سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، جلد ہفتم، نقوش لاہور، رسول نمبر جلد دوم ص ۹۹-۲۳۰۔

۲۳۶ء ملاحظہ ہو ولیم میور، لائف آف محمد، لندن ۱۸۶۱ء ص ۲۲۶؛ مارگولیتھ، محمد، لندن ۱۹۰۵ء ص ۲۲۶۔

۲۳۷ء ابن اسحاق، سیرت رسول اللہ، انگریزی ترجمہ، ص ۸-۱۹۷؛ ابن سعد، اول ص ۲۱۹؛ طبری، تاریخ جلد دوم ص ۵-۳۵۳؛ بلاذری، انساب الاشراف اول ص ۲۳۹۔

۲۳۸ء ابن اسحاق، ص ۹-۱۹۸؛ ابن سعد، سوم ص ۲۱-۲۰۴۔

۲۳۹ء ابن اسحاق، ص ۱۹۹؛ ابن سعد، سوم ص ۱۱۸؛ انساب الاشراف، اول ص ۲۳۹، طبری دوم

ص۳۵۷؛ اور ص۳۶۶۔

۲۴۰ھ ملاحظہ ہو ابن سعد اور اسد الغابہ وغیرہ میں ان کے تراجم نیز عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت کا باب دوم۔

۲۴۱ھ ملاحظہ ہو عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، باب دوم ص۲۰-۴۱۔

۲۴۲ھ غزوات وسرایا کی نوعیت پر بحث کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں محرکات، مسائل اور مقاصد" نقوش رسول نمبر لاہور ۱۹۸۴ء جلد دوازدہم ص۲۴۲-۲۸۳۔

۲۴۳ھ ابن اسحاق، ص۲۸۸؛ واقدی، کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونس، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء ص۱۵؛ ابن سعد، دوم ص۱۱، ص۶-۳۵، ص۵-۶۲، طبری، دوم ص۱۳ا۴، نیز عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول ودوم۔

۲۴۴ھ ابن اسحاق ص۶۷۲ وغیرہ؛ ابن سعد، ص۸۹، ص۱۴۷، ص۱۷۸ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو تنظیم ریاست وحکومت کا باب دوم۔

۲۴۵ھ اس بحث کے لیے ملاحظہ ہو تنظیم ریاست وحکومت کے متعلقہ ابواب، نیز محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق، طبع قاہرہ ص۲۳، ص۲۹، ص۴۱، ص۴۹، وغیرہ۔

۲۴۶ھ سورہ توبہ ۲۴:

۲۴۷ھ ابن سعد، اول ص۲۲، زبیری، نسب قریش، ص۲۵۴؛ ابن سعد، سوم ص۲۰-۱۱۶، ص۱۲-۴۰۸ وغیرہ۔

۲۴۸ھ بخاری، صحیح، باب الہجرۃ؛ ابوداؤد، سنن، ص۱۲۹ بحوالہ شبلی نعمانی، سیرت النبی، دوم ص۹۰؛ مسند احمد بن حنبل، بحوالہ شبلی نعمانی ص۹۰

۲۴۹ھ واقدی، ص۳۴۷، ابن سعد، دوم ص۵۲، ص۵۶؛ طبری، دوم ص۵۳۸ اور ص۶-۵۴۵ نیز بخاری، غزوہ بئر معونہ، ابن سعد، سوم وچہارم شہداء بئر معونہ، رجیع اور حضرت ابوہریرہ کے لیے خاص کر ابن سعد، چہارم ص۱۴-۳۲۵

۲۵۰ھ بخاری، فضائل اصحاب النبی؛ زبیری، ص۱۴۴؛ کتانی، التراتیب الاداریہ، اول ص۱۴-۴۰۔

۲۵۱ھ کتاب المحبر، ص۲۸۶ اور ابن سعد، سوم ص۵۱۳۔

۲۵۲ھ ابن سعد، ہشتم صحابیات کا باب۔ نیز ملاحظہ ہو سید سلیمان ندوی، سیرت عائشہ، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء ص۱۱۲ وغیرہ۔

۲۵۳ھ بحوالہ شبلی نعمانی، دوم ص۸۸؛ بخاری، صحیح باب رحمۃ البہائم؛ ابن سعد، پنجم ص۵۶۴۔

۲۵۴ھ بخاری، صحیح، غزوۂ فتح ؛ ابوداؤد اور نسائی، کتاب الصلوٰۃ ؛ طبری، سوم ص۳۸۲ ۔

۲۵۵ھ ابن ہشام، دوم ص۵۰ ؛ واقدی، ص۸۸۹ اور ص۹۵۹ ؛ ابن سعد، دوم ص۱۳۷ ؛ طبری، سوم ص۹۴ نیز ملاحظہ ہو: واقدی، ص۲-۹۳۱

۲۵۶ھ ابن سعد ص۵۸۴ ۔ ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی۔

۲۵۷ھ ملاحظہ ہو تنظیم ریاست وحکومت کا باب چہارم ؛ مجموعۃ الوثائق ص۳-۷۱ ۔

۲۵۸ھ ابن سعد، دوم ص۳۳۵، ص۳۴۰، ص۳۴۸ اور ص۳۵۰ اور کتانی، اول ص۵-۵۶ ۔

۲۵۹ھ ابن سعد کی طبقات کبریٰ کی جلد سوم، چہارم، پنجم، ششم اور ہفتم ملاحظہ ہوں۔

۲۶۰ھ بخاری کتاب الجمعہ ۔

۲۶۱ھ ابن سعد، سوم ۶۰۹ ۔

۲۶۲ھ ابن اسحاق ۲۰۰-۱۹۹ ؛ ابن سعد، سوم ۶۰۹ ۔

۲۶۳ھ اسد الغابہ دوم ص۵۶ ۔

۲۶۴ھ بخاری، صحیح، کتاب الصلوٰۃ، ابوداؤد، سنن، کتاب الصلوٰۃ : ابن اسحاق ، سیرت رسول اللہ، اور ابن ہشام کے سابقہ حوالے۔

۲۶۵ھ بخاری، صحیح الصلوٰۃ ؛ واقدی ۸- ۱۰۴۶ ؛ ۱۰۷۳ ابن سعد، سوم، ۵۵، چہارم ۳۴۵ ؛ اسد الغابہ، سوم ۲۲۷ اور ۶۰-۳۵۹ ۔ نیز ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، دوم، ص۹۲ اور کتانی اول ص۷۷ ۔

۲۶۶ھ بحوالہ شبلی نعمانی، ص۹۲ نیز ملاحظہ ہو واقدی، ص۲۷۱ ۔

۲۶۷ھ ملاحظہ ہو تنظیم ریاست وحکومت کا باب اول اور اس کے متعلقہ حواشی اور تعلیقات۔

۲۶۸ھ نسائی، سنن، کتاب المساجد، کتاب الصلوٰۃ ؛ ابن سعد، پنجم ص۲۴۶، ص۹-۵۰۸ ؛ بلاذری، فتوح البلدان، ص۸-۸۷ ؛ اسد الغابہ دوم ص۳۸۸ ؛ واقدی، ص۷-۸۴۵ ؛ ص۸۸۲ اور ص۹۸۰، نیز ملاحظہ ہو شبلی نعمانی دوم ص۳-۹۲

۲۶۹ھ واقدی، ص۱۷۷، ص۹۹۵، ص۱۰۱۲ ؛ ابن سعد، دوم ص۱۶۵، زبیری، ص۲۶۵، طبری، سوم ص۱۹۶ ؛ بخاری، باب بدء الاذان۔

۲۷۰ھ بخاری، باب بدء الاذان، باب مواقیت الصلوٰۃ ؛ ابن اسحاق، ص۶-۲۳۵، ابن سعد، سوم ص۲۳۴، ص۳۲۸ ؛ نیز اول ص۲۴۸ ۔ اسد الغابہ سوم ص۲ ؛ زبیری، ص۳۹۹ ؛

ابن سعد، پنجم ص ۵۰۴ ؛ اسد الغابہ، دوم ص ۳-۲۸۲ ، ص ۳۲۱ ؛ نیز ملاحظہ ہو کتانی، اول ص ۷-۷۶ ۔

۲۷۱ ازرقی، کتاب اخبار مکہ، بیروت ۱۹۶۴ء، ص ۸-۱۲۷ ؛ ابن سعد، پنجم دوم ص ۱۲۷ ، ص ۱۶۸ ، ص ۱۶۲ ، پنجم ص ۴۴۶ ؛ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر ص ۱۱ ؛ ابن ہشام، دوم ص ۵۰۰ ، ص ۵۲۵ ؛ واقدی ص ۸۲۵ ، ص ۹۵۹ ، ص ۸-۱۰۷۷ ، بخاری، کتاب الحج ؛ حجۃ الوداع ؛ مسلم اور ابوداؤد، حجۃ الوداع ؛ ابن اسحاق ص ۶۵۲ ، طبری، سوم ص ۱۵۱ ؛ اسد الغابہ، اول ص ۲-۱۳۱ ؛ کتانی، اول ص ۱۰۹ ۔

۲۷۲ طبری، دوم ص ۶۲۳ ؛ واقدی، ص ۵۲۲ ، ص ۵۳۲ ، ص ۱۰۷۷ ، ص ۱۰۹۰ ؛ ابن سعد، دوم ص ۱۲۱ ، ص ۱۶۳ ، ص ۱۹۸ ؛ اسد الغابہ، دوم ص ۲۷۸ ۔ چہارم ص ۹۲ ، پنجم ص ۲ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن حزم، جمہرۃ انساب العرب، بیروت طبع ص ۱۶۹ ۔

۲۷۳ واقدی، ص ۸۳۸ ؛ ابن سعد، دوم ص ۱۳۷ ؛ چہارم ص ۲۵ ؛ بخاری، کتاب الحج ؛ اسد الغابہ، سوم ص ۱۲-۱۰۹ ، ص ۱۲۱ ؛ نیز واقدی، ص ۸۳۷ ، ص ۸۴۲ ، بخاری، کتاب الصلوٰۃ ؛ اسد، سوم ص ۳۷۳ ؛ زبیری، ص ۲-۱۵۱ اور اسد، اول ص ۲۱۴ اسی ترتیب سے ۔

کتابیات

ابن ابی الحدید (عبدالحمید بن ہبۃ اللہ، م ۶۵۵ھ/۱۲۵۹ء) شرح نہج البلاغۃ، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

ابن اثیر (عزالدین علی بن محمد، م ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء)، اسد الغابہ، طہران ۱۹۰۹ء، الکامل فی التاریخ، بیروت ۱۹۶۵ء

ابن اسحاق (محمد بن اسحاق، م ۱۵۰ھ/۷۶۷ء)، السیرۃ النبویہ/سیرۃ رسول اللہ، رباط ۱۹۶۷ء۔

ابن حجر عسقلانی (احمد بن علی، م ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) الاصابہ فی تمیز الصحابہ، قاہرہ ۱۹۳۹ء، تہذیب التہذیب حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء، فتح الباری فی شرح البخاری، بولاق ۱۸۸۲ء؛ لسان المیزان، حیدرآباد دکن ۱۹۱۱ء

ابن حزم (علی بن احمد، م ۴۵۶ھ/۱۰۶۴ء)، جمہرۃ انساب العرب، قاہرہ ۱۹۴۸ء، جوامع السیرۃ، قاہرہ ۱۹۵۶ء

ابن حنبل (احمد بن محمد، م ۲۴۱ھ/۸۵۵ء) المسند، قاہرہ ۱۹۴۹ء

ابن خلدون (عبدالرحمٰن بن محمد، م ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء) کتاب العبر (تاریخ ابن خلدون)، بیروت ۱۹۵۶ء؛ المقدمہ، مطبعہ مصطفیٰ محمد، قاہرہ (غیر مورخہ)۔

ابن خلکان (احمد بن محمد، م ۶۸۱ھ/۱۲۸۱ء)، وفیات الاعیان، بولاق ۱۸۵۹ء۔

ابن سعد (محمد بن سعد، م ۲۳۰ھ/۸۴۵ء)، الطبقات الکبریٰ، بیروت ۱۹۵۷ء۔

ابن سید الناس (محمد بن محمد، م ۷۳۴ھ/۱۳۳۴ء)، عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، قاہرہ ۱۹۳۷ء

ابن الطقطقی (محمد بن علی بن طباطبا، م ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء)، کتاب الفخری، قاہرہ ۱۸۹۹ء۔

ابن عبدالبر (یوسف بن عبداللہ، م ۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، حیدرآباد دکن ۱۹۰۰ء

ابن عبد ربہ (احمد بن محمد، م ۳۲۸ھ/۹۴۰ء)، العقد الفرید، قاہرہ ۱۹۴۰ء

ابن العربی (قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ، م ۵۴۳ھ/۱۱۴۸ء)، احکام القرآن، قاہرہ ۱۹۵۷ء۔

ابن العماد حنبلی (عبدالحی بن محمد، م ۱۰۸۹ھ/۱۶۷۸ء) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، قاہرہ ۱۳۵۰ھ۔

ابن قتیبہ (عبداللہ بن مسلم دینوری، م ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) الشعر والشعراء، لائیڈن ۱۹۰۲ء، عیون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ء؛ کتاب المعارف، قاہرہ ۱۹۶۰ء۔

ابن قیم (الجوزیہ، شمس الدین م ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء)، زاد المعاد فی ہدی سید العباد، قاہرہ ۱۹۷۱ء؛ بلوغ السول فی اقضیۃ الرسول، الہند ۱۸۷۴ء۔

ابن کثیر (اسمٰعیل بن عمر، م ۷۷۴ھ/۱۳۷۲ء) السیرۃ النبویہ، بیروت ۱۹۶۳ء؛ البدایہ والنہایہ، قاہرہ ۱۹۳۲ء؛ الفصول فی سیرۃ الرسول، دمشق [illegible]

ابن ماجہ (محمد بن یزید، م ۲۷۳ھ/۸۸۶ء)، سنن قاہرہ ۱۹۵۲ء۔

ابن منظور (محمد بن مکرم، م ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء)، لسان العرب، بیروت ۱۹۵۵-۶ء۔

ابن ہشام (عبدالملک بن ہشام، م ۲۱۸ھ/۸۳۳ء)، السیرۃ النبویہ، قاہرہ ۱۹۲۵ء۔

ابوحنیفہ دینوری (احمد بن داؤد م ۲۸۲ھ/۸۹۵ء)، کتاب الاخبار الطوال، لائیڈن ۱۸۸۸ء۔

ابوداؤد (سلیمان بن الاشعث، م ۲۷۵ھ/۸۸۸ء)، السنن، قاہرہ ۱۹۲۲ء۔

ابوزرعہ دمشقی (عبدالرحمٰن بن عامر، م ۲۸۲ھ/۸۹۵ء)، سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتاریخ الخلفاء الراشدین، دمشق ۱۹۸۰ء۔

ابوعبید قاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ/۸۳۶ء)، کتاب الاموال، قاہرہ ۱۹۳۴ء۔

ابویوسف (یعقوب بن ابراہیم، م ۱۸۲ھ/۷۹۸ء)، کتاب الخراج، قاہرہ ۱۹۳۳ء۔

ازرقی (محمد بن عبداللہ، م ۲۴۴ھ/۸۵۸ء)، اخبار مکہ، بیروت ۱۹۶۴ء۔

بخاری (محمد بن اسمٰعیل، م ۲۵۶ھ/۸۷۰ء)، الجامع الصحیح، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ التاریخ الکبیر، حیدرآباد دکن ۱۹۲۱ء

بغدادی (محمد بن حبیب، م ۲۴۵ھ/۸۵۹ء)، کتاب المحبر، حیدرآباد دکن ۱۹۴۲ء؛ کتاب المنمق، حیدرآباد دکن ۱۹۶۴ء۔

بلاذری (احمد بن یحییٰ بن جابر، م ۲۷۹ھ/۸۹۲ء)، انساب الاشراف، اول قاہرہ ۱۹۵۹ء، چہارم یروشلم ۱۹۳۸ء پنجم ۱۹۳۶ء؛ فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۳۲ء۔

ترمذی (محمد بن عیسیٰ، م ۲۷۹ھ/۸۹۲ء)، الجامع الصحیح، حمص ۱۹۶۹ء۔

جہشیاری (محمد بن عبدوس، م ۳۳۱ھ/۹۴۲ء)، کتاب الوزراء والکتاب، قاہرہ ۱۹۳۸ء۔

جمحی (محمد بن سلام، م ۲۳۱ھ/۸۴۵ء)، طبقات فحول الشعراء، قاہرہ ۱۹۵۲ء

خلیفہ بن خیاط (م ۲۴۰ھ/۸۵۴ء)، کتاب الطبقات، دمشق ۱۹۶۶ء؛ کتاب التاریخ، دمشق ۱۹۶۷ء

ذہبی (محمد بن احمد، م ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء)، تاریخ الاسلام، قاہرہ ۱۹۷۳ء، میزان الاعتدال، قاہرہ ۱۹۱۰ء تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد دکن ۱۹۱۴-۵ء۔

زبیری (مصعب بن عبداللہ، م ۲۳۶ھ/۸۵۱ء)، نسب قریش، قاہرہ ۱۹۵۳ء۔

سمہودی (علی بن عبداللہ، م ۹۱۱ھ/۱۵۱۵ء)، وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ، قاہرہ ۱۹۰۸-۹ء۔

سہیلی (عبدالرحمٰن بن عبداللہ، م ۵۸۱ھ/۱۱۸۵ء)، الروض الانف، قاہرہ (غیر مورخہ)۔

شامی (محمد بن یوسف، م ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء)، سبل الہدیٰ والرشاد فی سیرۃ خیر العباد (سیرۃ شامی) قاہرہ ۱۹۷۵ء

طبری (محمد بن جریر، م ۳۱۰ھ/۹۲۳ء)، تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری) قاہرہ ۱۹۶۰ء۔ تہذیب الآثار مرتبہ محمود محمد شاکر، ریاض ۱۹۸۲ء، جامع البیان عن تاویل آی القرآن (تفسیر طبری) قاہرہ ۱۹۶۰ء

فاکہی (محمد بن اسحاق، م ۲۷۲ھ / ۸۸۲ء)، المنتقیٰ فی اخبار ام القریٰ، بیروت ۱۹۶۴ء۔

قاضی عیاض (بن موسیٰ یحصبی، م ۵۴۲ھ / ۱۱۴۷ء) الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ، قاہرہ ۱۹۵۰ء۔

مالک بن انس (م ۱۷۹ھ / ۷۹۵ء) موطا، قاہرہ ۱۹۵۱ء۔

ماوردی (ابوالحسن علی بن محمد، م ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء)، الاحکام السلطانیہ، قاہرہ ۱۸۸۱ء

مسعودی (علی بن حسین م ۳۴۵ھ / ۹۵۶ء) مروج الذہب، قاہرہ ۱۹۲۷ء، کتاب التنبیہ والاشراف لائیڈن ۱۸۹۴ء۔

مسلم بن حجاج (م ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء)، الجامع الصحیح، قاہرہ ۱۹۵۵ء

مقریزی (احمد بن علی، م ۸۴۵ھ / ۱۲۴۲ء)، امتاع الاسماع، قاہرہ ۱۹۴۱ء

نسائی (احمد بن شعیب، م ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء)، سنن، کانپور، ۱۸۸۲ء۔

نووی (یحییٰ بن شرف الدین، م ۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء) ریاض الصالحین، دمشق ۱۹۷۶ء، شرح صحیح مسلم، قاہرہ ۱۹۲۸ء

واقدی (محمد بن عمر، م ۲۰۷ھ / ۸۲۲ء) کتاب المغازی، لندن ۱۹۶۶ء۔

یاقوت حموی (م ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء)، ارشاد الاریب، لائیڈن ۱۹۰۷-۳۱ء؛ معجم البلدان، بیروت ۱۹۵۶ء

یحییٰ بن آدم (م ۲۰۳ھ / ۸۱۸ء)، کتاب الخراج، لائیڈن ۱۸۹۶ء

یعقوبی (احمد بن ابی یعقوب، م ۲۸۴ھ / ۸۹۷ء)، تاریخ یعقوبی، بیروت ۱۹۶۰ء؛ کتاب البلدان، لائیڈن ۱۸۶۰ء۔
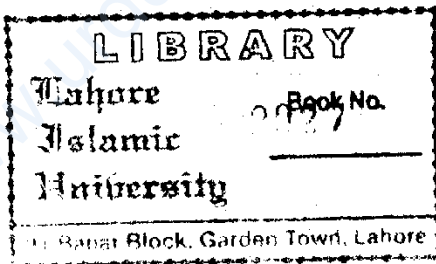
اہم ثانوی کتابیں

ابوالاعلیٰ مودودی: خلافت و ملوکیت، دہلی ۱۹۶۹ء، سیرت سرور عالم، دہلی ۱۹۸۱ء

ابوالکلام آزاد: رسول رحمت، دہلی ۱۹۸۲ء

ابوالحسن علی ندوی: نبی رحمت اردو ترجمہ السیرۃ النبویہ لکھنؤ ۱۹۷۸ء اور جدہ ۱۹۸۹ء بالترتیب۔

احمد امین: فجر الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۴ء، ضحی الاسلام، قاہرہ ۱۹۶۴ء۔

اکرم ضیاء عمری: المجتمع المدنی فی عہد النبوۃ، مدینہ منورہ ۱۹۸۳ء۔

ڈی، سی ڈینیٹ: Conversion and Poll-Tax in Early Islam، کیمبرج ۱۹۵۰ء
اردو ترجمہ جزیہ اور اسلام از مہر لاہور ۱۹۷۱ء ریوبن لیوی، دی سوشل اسٹرکچر آف اسلام، کیمبرج ۱۹۵۰ء۔

شاہ محمد سلیمان منصور پوری: رحمۃ للعالمین، دہلی ۱۹۸۰ء۔

شاہ معین الدین احمد ندوی: تاریخ اسلام، اعظم گڑھ ۱۹۵۳ء۔

شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی: سیرت النبی، اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء۔

صالح احمد علی: تنظیمات الرسول الاداریہ فی المدینہ، بغداد ۱۹۶۰ء۔

فرانسسکو جبریلی: اے شارٹ ہسٹری آف دی عربس، لندن ۱۹۶۵ء۔

فلپ کے ہٹی: دی ہسٹری آف دی عربس، نیویارک ۱۹۶۴ء؛ میکرز آف عرب ہسٹری، لندن ۱۹۶۹ء۔

مارگولیتھ، ڈی، ایس: محمد اینڈ رائز آف اسلام، لندن ۱۹۰۵ء۔

محمد ادریس کاندھلوی: سیرۃ المصطفیٰ، دیوبند (غیر مورخہ)۔

محمد حمید اللہ: نبی اکرمؐ کی سیاسی زندگی، کراچی ۱۹۶۹ء؛ عہد نبوی کا نظام حکمرانی، حیدرآباد ۱۹۲۹ء
محمد رسول اللہؐ، لاہور ۱۹۸۲ء (اردو/انگریزی)۔

محمد لقمان اعظمی ندوی: مجتمع المدینۃ المنورۃ فی عہد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، قاہرہ ۱۹۸۸ء

محمد یٰسین مظہر صدیقی: عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت، دہلی ۱۹۸۸ء اور نقوش رسول نمبر، Organisation of Government under the Prophet. دہلی ۱۹۸۷ء، لاہور ۱۹۸۸ء

نثار احمد: عہد نبوی میں اسلامی ریاست کا نشو و نما و ارتقاء، نقوش، رسول نمبر لاہور ۱۹۸۲ء۔

ولیم مونٹگمری واٹ: محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء؛ محمد ایٹ مدینہ، آکسفورڈ ۱۹۵۶ء۔

ولیم میور: دی لائف آف محمدؐ، ایڈنبرا ۱۹۲۳ء۔

ادارہ تحقیق و تصنیف کی گرانقدر مطبوعات

تصنیف	مصنف	صفحات	قیمت
معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدر الدین اصلاحی	۳۱۶	۳۵/=
صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	مولانا سید جلال الدین عمری	۲۸۸	۴۰/=
اسلام میں خدمت خلق کا تصور	"	۱۴۶	۴۵/=
مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	"	۲۰۰	۳۵/=
اسلام اور مشکلات حیات	"	۸۹	۸/=
مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰/=
مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام	"	۱۰۴	۳۰/=
عہد نبوی کا نظام حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰/=
ایمان و عمل کا قرآنی تصور	الطاف احمد اعظمی	۲۸۰	۲۵/=
تصوف — ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	۲۰۰	۲۵/=
عہد نبوی کے غزوات و سرایا	ڈاکٹر رؤف اقبال	۳۲۴	۳۵/=

ادارۂ تحقیق نے اپنی اردو اور انگریزی مطبوعات کے علاوہ دیگر اہم مکتبوں کی علمی و دینی کتب کی فراہمی کا بھی انتظام کیا ہے۔ فہرست کتب ایک خط لکھ کر طلب کریں۔

مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھپور، علی گڑھ